سازِ صدف

عدم

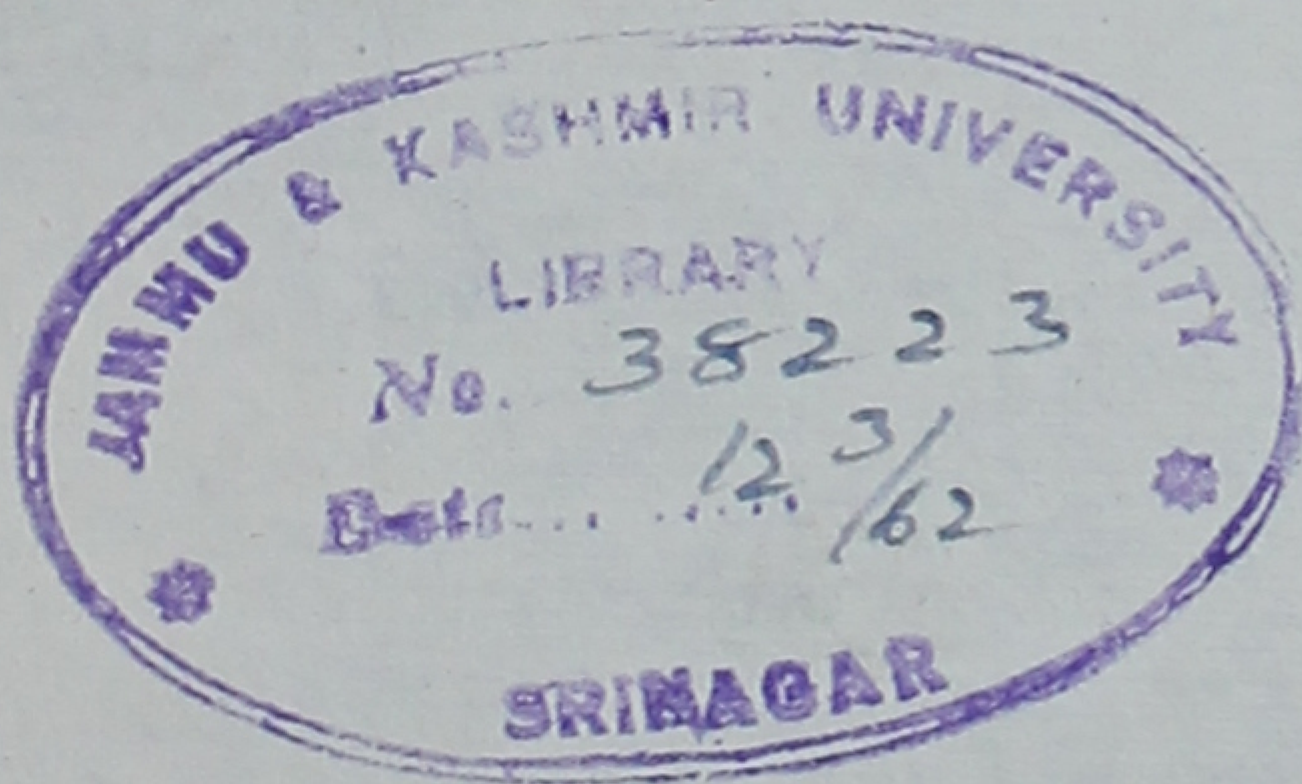
ناشران

آزاد بک ڈپو ہال بازار
امرتسر

بار اوّل

تعداد ۵۰۰

قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے (۲/۸/۰)



پریم پریس امرتسر میں

باہتمام

رام سرن مہاجن پرنٹر طبع

ہوئی

زمانہ جب تری رفتار کی تعریف کرتا ہے

مجھے اپنی طبیعت کی روانی یاد آتی ہے

عدمؔ



دِل تری انکھڑیوں کا حامی ہے
کس قدر نوجوان خامی ہے

جس نے دیکھا ہے تیری زلفوں کو
اس کی آشفتگی دوامی ہے

زیست حیراں۔ موت سرگشتہ
ناتمامی سی ناتمامی ہے!

آپ ہیں یا نسیم کا جھونکا!
کون محوِ سبک خرامی ہے؟

شیخ صرف آدمی نہیں۔ ورنہ
آدمی تو بہت گرامی ہے!

ترکِ مے سوچ کر قدم کرنا
زندگی ایک تشنہ کامی ہے



عشق خود محشرِ فغاں ہوگا
ماتمِ مرگِ نوجواں ہوگا!

اُن کے پیشِ نظر تماشا تھا
مَیں نے سمجھا تھا امتحاں ہوگا

تم بھی خاموش، ہم بھی لب بستہ
کیسے آغازِ داستاں ہوگا

برق کو مجھ سے کیا عداوت تھی
کسی دشمن کا آشیاں ہوگا

جس سے ٹکرا گیا تھا پیمانہ
غالباً دَورِ آسماں ہوگا

ہم کو پہنچا اگر کوئی صدمہ!
رنج تم کو بھی بیکراں ہوگا

میکدہ اور صحبتِ خوباں!
کیا حیات آفریں سماں ہوگا

کاکلیں جب بکھر گئیں تیری
کون مشتاقِ کہکشاں ہوگا

گلستاں اپنے ساتھ لے چلئے
باغ میں موسمِ خزاں ہوگا

دیکھ تو چل کے میکدے میں عدمؔ
چشمۂ زندگی رواں ہوگا



لُطف کی بات ہونے والی تھی
آج برسات ہونے والی تھی

چاند ہی بدگماں رہے۔ ورنہ
چاندنی رات ہونے والی تھی

اتفاقاً کچھ ایسی آشفتہ!
شکلِ حالات ہونے والی تھی

زندگی کیا ہے؟ خود منیت بھی
غرقِ ظلمات ہونے والی تھی!

جو نظر وہ بچا گئے ہم سے
وہ خرابات ہونے والی تھی

یا پیامات کو ترستے ہیں
یا ملاقات ہونے والی تھی

اس کس بات کی تھی ہم کو خدم
اور کیا بات ہونے والی تھی



کہتے ہیں جس کو زلف، بہاروں کا نام ہے
مستی فروش چاند ستاروں کا نام ہے

اے کاش اس کا ہلکا سا سایہ ہی ہو نصیب
گیسو تو بے پناہ قراروں کا نام ہے

خیر اس قدر بُرا تو نہیں عالم خرد
ٹوٹے ہوئے لبسیط خماروں کا نام ہے

کہتے ہیں جس کو حُسن ہے ٹھنڈک بہار کی
کہتے ہیں جس کو عشق شراروں کا نام ہے

کہتے ہیں جس کو عہدِ جوانی وُہ ہوشیار
مدہوش آہوؤں کے طراروں کا نام ہے

شق ہو گیا ہے دیکھ کے اس حادثے کو دل
کمبخت زندگی بھی سہاروں کا نام ہے

شاید ترے سفر کو ہو منزل کی جستجو!
میرا سفر تو راہگزاروں کا نام ہے

کہتے ہیں جس کو مغفرتِ حق وہ میکدہ
میرا گماں ہے بادہ گساروں کا نام ہے

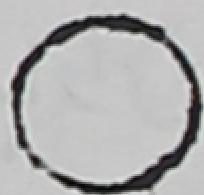
کہتے ہیں جس کو "ہیر" وہ جلتا ہوا خلوص
ہنستے ہوئے چناب کے دھاروں کا نام ہے

مدہوشی شعور کوئی فلسفہ نہیں
ساقی کی انکھڑیوں کے اشاروں کا نام ہے

تعریف کیا کروں میں محبت کی اے عدم
لہروں کا کونپلوں کا ستاروں کا نام ہے



ہمجولیوں کے ساتھ جوانی کی رات تھی
پھولوں کا تذکرہ تھا ستاروں کی بات تھی
میں نے ہر ایک چیز کو اپنا سمجھ لیا
مجھ کو خبر نہ تھی یہ تری کائنات تھی
کلیوں کے اضطراب سے اُڑتا ہے رنگِ گل
پچھلی بہار میں بھی کچھ ایسی ہی بات تھی
اپنا تو زندگی سے تعلق نہ تھا کوئی
تیری نگاہ صرف کفیلِ حیات تھی
توبہ کو توڑنا ہی مناسب تھا اے علیمؔ
یاروں کی ٹولیاں تھیں بہاروں کی رات تھی



وہ جاتے جاتے ہنس کے جو اِک بات کر گئے
دورِ زماں کو دورِ خرابات کر گئے

ڈالی نظر تو رواجِ خرابات بخش دی
کی گفتگو تو بارشِ نغمات کر گئے

ہم نے متاعِ زیست کو ضائع نہیں کیا
دو چار روز سیرِ خرابات کر گئے

آئے تھے مجھ سے ملنے مگر میں نہ جب ملا
وہ میری بے خودی سے ملاقات کر گئے

میں عمر بھر علامؔ نہ کوئی دے سکا جواب
وہ اِک نظر میں اتنے سوالات کر گئے



شادابئ مزاجِ بہاراں کا وقت ہے
گل ریزئ خرامِ غزالاں کا وقت ہے

ایسا خدا کسی پہ نہ لائے شدید وقت
اے دوستو! جدائ یاراں کا وقت ہے

زلفیں بکھیر، جام اُٹھا، ہنس کے بات کر
ساقی نزولِ رحمتِ یزداں کا وقت ہے

یادِ خدا میں کون جوانی کا خوں کرے
یہ وقت تو پرستشِ خوباں کا وقت ہے

اے شیخ میکدے سے تو رخصت بھی ہو کہیں
اے بے ادب عبادتِ یزداں کا وقت ہے

میں دِل ہوں آپ جان ہیں اور اتفاق سے
یہ وقت اتصالِ دِل و جاں کا وقت ہے

اے غیرتِ مسیح تری آنکھ کے نثار
غمہائے لاعلاج کے درماں کا وقت ہے

ساحل عزیز کس کو نہیں اے عزیزِ من
لیکن یہ وقت شورشِ طوفاں کا وقت ہے

یزداں و اہرمن کے زمانے گذر گئے
اب وقت ہر لحاظ سے انساں کا وقت ہے

اے عقل فصلِ گُل میں نہ کر اذنِ احتیاط
اے نامراد چاکِ گریباں کا وقت ہے

خلوت میں بھی حضور اُٹھاتے نہیں نظر!
کیا یہ بھی التفاتِ گریزاں کا وقت ہے

کرتا ہے کس عتاب سے کم بخت گفتگو
لیکن ہو کیا علاج کہ درباں کا وقت ہے

اے دوست وقتِ صبح ہے تو بھی طلوع ہو
اے نورِ حق، تلاوتِ قرآں کا وقت ہے

کیا کر رہا ہے بیٹھ کے حجرے میں اے عدم
ظالم طوافِ کوچۂ جاناں کا وقت ہے



ان کے الزام یاد آتے ہیں!
پھول اور جام یاد آتے ہیں

جب بھی آتا ہے جام ہاتھوں میں
سینکڑوں نام یاد آتے ہیں

ڈال دو زہر آبگینوں میں!
تلخ ایام یاد آتے ہیں

شام کے وقت میگساروں کو
کیا حسیں کام یاد آتے ہیں

غم کے لمحات میں عدم اکثر
پچھلے آرام یاد آتے ہیں



زخمِ دل کے اگر سِئے ہوتے
اہلِ دل کس طرح جئے ہوتے

وہ ملے بھی تو اک جھجک سی رہی
کاش تھوڑی سی ہم پئے ہوتے

آرزو مطمئن تو ہو جاتی!!
اور بھی کچھ ستم کئے ہوتے

میری اُلجھن کی بات ہی کیا تھی
ان کے گیسو سنور لئے ہوتے

لذتِ غم تو بخش دی اُس نے
حوصلے بھی عدمؔ دئے ہوتے



مدت ہوئی ہے موت کو مہماں کئے ہوئے
ہستی کی مشکلات کو آساں کئے ہوئے

اب کیا درست ہوگئے زمانے کے کاروبار
وہ آرہے ہیں بال پریشاں کئے ہوئے

جی چاہتا ہے عہدِ جوانی گذار دوں
سر کو سپردِ زانوئے جاناں کئے ہوئے

بیدار ہو رہا ہے تصور کا بُت کدہ
صدہا تکلفات کا ساماں کئے ہوئے

پھر کاروبارِ خاص میں مصروف ہے خرد
قندیلِ مصلحت کو فروزاں کئے ہوئے

پیوست ہو رہے ہیں لبوں پر کسی کے لب
شیرینیٔ دہن کو رگِ جاں کئے ہوئے

تکمیل خود نمائی پہ مائل ہے پھر شباب
ڈستے ہوئے خطوط کو عریاں کئے ہوئے

اے آفتابِ حُسنِ ازل کچھ خیال کر
بیٹھی ہے رات چاک گریباں کئے ہوئے

رُخ سے نقاب اُٹھا کہ بڑی دیر ہو گئی!
ماحول کو تلاوتِ قرآں کئے ہوئے

آجا خرامِ ناز کی لہروں کے دوش پر
گل پوش راستوں کو غزلخواں کئے ہوئے

پھر تیز ہو رہی ہیں ہوس کی ضرورتیں
شبنم کو آفتاب کا مہماں کئے ہوئے

پھر پردہ در ہے عشق کا ذوقِ مصوری
یوسف کے پیرہن کو گریباں کئے ہوئے

پھر جا رہا ہوں اسکی گلی میں بصد خروش
سامانِ بدحواسیٔ درباں کئے ہوئے

پھر دل میں اُٹھ رہا ہے خرابی کا ولولہ
بازارِ احتیاط کو ویراں کیے ہوئے

پھر گرم خواہشات کا موسم ہے جوش پر
قطرے کو موج موج کو طوفاں کیے ہوئے

پھر آ رہی ہے بام پہ خود بینیٔ جمال!
غمزے کی دوپہر کو درخشاں کیے ہوئے

ترکش بدوش پھر چلی آتی ہے زندگی
اندازۂ جراحتِ پنہاں کیے ہوئے

پھر جا رہا ہوں سوئے خرابات اے عدمؔ
توبہ کی گمرہی کو مسلماں کیے ہوئے



مشکل یہ آپڑی ہے کہ گردش میں جام ہے
اے ہوش ورنہ مجھ کو ترا احترام ہے
فرصت کا وقت ڈھونڈھ کے ملنا کبھی اجل!
مجھ کو بھی کام ہے ابھی تجھکو بھی کام ہے
آتی بہت قریب سے خوشبو ہے یار کی!
جاری اِدھر اُدھر ہی کہیں دَورِ جام ہے
یوں دل میں یاد آتی ہے ماضی کی جس طرح
اُجڑے دیار میں کوئی محوِ خرام ہے!
اے زلفِ عنبریں ذرا لہرا کے پھیلنا!
اک رات اس چمن میں مرا ابھی قیام ہے
میں ہی نہیں حواس کی تلخی سے جاں بلب
میرا مشاہدہ ہے یہ تکلیفِ عام ہے

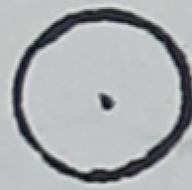
اُس چشمِ باخبر کے سلیقے تو دیکھئے!!
مستی میں آگہی ہے، تفکّر میں جام ہے
مے اور حرام؟ حضرتِ زاہد خدا کا خوف
وہ تو کہا گیا تھا کہ مستی حرام ہے
اے زندگی تو آپ ہی چپکے سے دیکھ لے
جامِ عدم پہ لکھا ہوا اُن کا نام ہے!





درد لا دوا بھی ہے — حاصلِ شفا بھی ہے
یوں ہی اتنی برہمی! — میں نے کچھ کہا بھی ہے
آپ غور اگر کریں — وہم کی دوا بھی ہے
عشق زندگی بھی ہے — عشق بد دُعا بھی ہے
عشق نامراد کا! — کوئی مدّعا بھی ہے
لطف بے رخی بھی ہے — جورِ اعتنا بھی ہے
ابتدا کی سادگی — صدقِ انتہا بھی ہے
کچھ مری خطا بھی ہے — کچھ تری رضا بھی ہے
اب بغیر دوستی — کوئی راستا بھی ہے
تو فقط صنم نہیں! — جانِ من خدا بھی ہے
تیرے پائے ناز پر — بندگی روا بھی ہے
آدمی کو پُوجنا! — اذنِ کبریا بھی ہے

آ کہ میری روح میں خلد کی ہوا بھی ہے
اس سکوت گاہ میں محشر نوا بھی ہے!!
حُسنِ اتفاق ہے!! مَے بھی ہے صبا بھی ہے
مرمریں کنول بھی ہیں سُرمگیں گھٹا بھی ہے
رابطِ ہستی و عدم
کم بھی ہے سوا بھی ہے



جب وہ مصروفِ رقص و رم ہونگے
کتنے محشر بہ قدم ہوں گے

تجھ سے بے انتہا محبت ہے
تجھ پہ قربان دم بدم ہوں گے

جائیے اور تلاش کر لیجئے
ہم سے ناداں جہاں میں کم ہونگے

زندگی اور سکون ناممکن !
خُلد میں بھی ہزار غم ہوں گے

رات کوئی تو تھا نشے میں ضرور
تم نہ ہو گے تو خیر ہم ہوں گے

یار بیٹھے رہیں تو بہتر ہے
یار مشکل سے پھر بہم ہوں گے

بن گئے جو حوادثِ ہستی
آپ کے گیسوؤں کے خم ہونگے

آپ ہی سے نہیں ہمیں شکوہ
کچھ زمانے کے بھی کرم ہونگے

حشر کا حال بھی ہویدا ہے
یا خدا ہوگا یا صنم ہوں گے

سہہ گئے جو عذاب ہستی کا
لازماً حضرتِ عدم ہوں گے





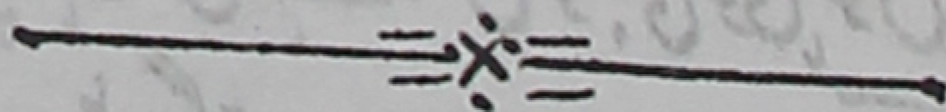
رات اُس زلفِ پریشاں میں کوئی پھول نہ تھا
حادثہ ہے کہ گلستاں میں کوئی پھول نہ تھا

میں نے دیکھی ہے بگولوں میں جوانی اُن کی
لوگ کہتے ہیں بیاباں میں کوئی پھول نہ تھا

آپ جب صبحِ ازل مجھ کو ملے تھے ہنس کر
کیا مرے چاکِ گریباں میں کوئی پھول نہ تھا؟

میں نے پوچھا تھا کھلیں گے یہاں کب تک غنچے
میں نے دیکھا تو گلستان میں کوئی پھول نہ تھا

اس کی آنکھوں نے عدمؔ رکھ لیا پردہ ورنہ
دامنِ فصلِ بہاراں میں کوئی پھول نہ تھا!





یہ الگ بات ہے ساقی کہ مجھے ہوش نہیں
ورنہ میں کچھ بھی ہوں احسان فراموش نہیں
نگہتِ گُل بھی ہے اِک وحشتِ نازک کی مثال
بارِ ہستی سے کوئی چیز سبکدوش نہیں
آہ وہ قرب کہ ہے دوریٔ افزوں کی دلیل
ہائے وہ وصل کہ آغوش بہ آغوش نہیں
اس مروّت سے وہ معبود ہُوا ہے عریاں
مجھ کو آدابِ عبادت کا بھی کچھ ہوش نہیں
بیخودی میں مرا آغوش ہے مجھ سے آگے
شرم مت کیجئے مَیں شاملِ آغوش نہیں
ہوش خمیازۂ مستی ہے، تو مطلب یہ ہے
جس کو کچھ ہوش ہے اس کو بھی کوئی ہوش نہیں
کس طرح بیٹھ گئے وہ مرے پہلو میں عدم!
شک یہ پڑتا ہے کہ شاید مرا آغوش نہیں



غیرتِ اعتبار بن جاؤ
مہ جبیں ہو۔ نگار بن جاؤ

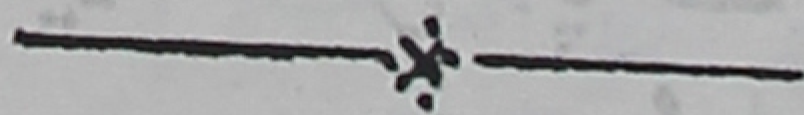
میں پرستارِ رنگ بنتا ہوں
تم خدائے بہار بن جاؤ

سال میں ایک دن تو آتا ہے
آج تو مے گسار بن جاؤ

مسکراہٹ بھی ایک شعلہ ہے
مسکرا کر چنار بن جاؤ

بے حسی کی چٹان ہے دُنیا
چشمۂ کوہسار بن جاؤ

تم کو بننا ہی کچھ اگر ہے عدمؔ
میکدے کا وقار بن جاؤ!





غمِ زیست پر مُسکرانا پڑا
ترے جبر کا گیت گانا پڑا
ارادہ تو نزدیک کا تھا مگر
بڑی دُور تک ہم کو جانا پڑا
سمجھ کر تری آنکھ کا مُدّعا
مشیّت کو بھی لڑکھڑانا پڑا
کیا جب جوانی نے عزمِ سفر
محبّت کو رستہ دکھانا پڑا
خزاں کی جبیں اتنی تاریک تھی
بہاروں پہ ایمان لانا پڑا
بڑی دیر دامن بچاتے رہے
بہت جلد ساغر اُٹھانا پڑا
عدمؔ کتنے بے کیف ماحول میں
ہمیں سازِ ہستی بجانا پڑا



جھوم کر بختِ نارسا نہ مِلا
مسکرا کر کبھی خدا نہ مِلا

لوگ جینے کی بات کرتے تھے
ہم کو مرنے کا بھی مزا نہ مِلا

میگساری روا ہے کس حد تک
اس کی آنکھوں کا فیصلہ نہ مِلا

ہوش اب ماورائے مستی ہے
آنکھ اب ہم سے ساقیا نہ ملا

آہ کتنی وسیع تھی دُنیا!
ایک بھی یارِ آشنا نہ مِلا

راستہ کٹ گیا سہولت سے
شکر ہے کوئی رہنما نہ مِلا

وہ بڑے خوش نصیب انسان تھے
جن کی کشتی کو ناخدا نہ ملا

ہم پہنچ تو گئے تھے منزل پر
اتفاقاً تِرا پتہ نہ مِلا!

کٹ گئی جستجو میں عمر عدمؔ
دردِ ہستی کا مُدّعا نہ ملا



نشاطِ دل ہے یا تسکینِ جاں ہے
مری ہر شے برائے دوستاں ہے

سماعت کو ذرا تکلیف دیجئے!
سکوتِ لالہ و گل نغمہ خواں ہے

مرے نزدیک پروانے کا جلنا
تری بیداد کا پہلا نشاں ہے

حیاتِ جاوداں کیا چیز ہوگی
حیاتِ عارضی بھی جاوداں ہے

مرے اوہام کی تردید ساقی
مجھے دریا پہ قطرے کا گماں ہے

عدم ہستی کے اُجڑے گلستاں میں
محبت ہی بہارِ بے خزاں ہے



اے دوست کیا بتائیں کہ کیا کیا نہ ہوسکا
قطرہ بنا بھی موج تو دریا نہ ہوسکا

احباب کا خلوص اگرچہ بُرا نہ تھا!!
احباب سے سلوک کچھ اچھا نہ ہوسکا

سوجھی تو خوب تھی غمِ امروز کو مگر!!!
دِل مبتلائے غمزۂ فردا نہ ہوسکا

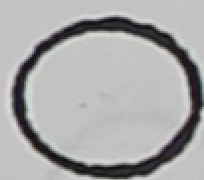
رسوائی کے لئے بھی ہے لازم خلوصِ عشق!
ہر بوالہوس جہان میں رسوا نہ ہوسکا

اس مہ جبیں کے وعدۂ محکم کو دیکھ کر
یوں مِٹ گیا یقین کہ پیدا نہ ہوسکا

کشتی بڑے خلوص سے غرقاب ہوگئی!
اندازۂ تلاطمِ دریا نہ ہوسکا!!

اے دوست اختلافِ طبیعت کے باوجود
ہم کو ترا فراق گوارا نہ ہو سکا
میرا مشاہدہ ہے کہ کل وقتِ میکشی
جو حال آپ کا تھا وہ میرا نہ ہو سکا
پھر اک حسین رات عدمؔ یونہی کٹ گئی!
سامانِ انبساط مہیّا نہ ہو سکا





صبحِ ازل ہی آپ کی نیت خراب تھی
میرے لئے کچھ اور نہیں تھا شراب تھی

میں آج اعتدال کی حد سے گذر گیا
ساقی خطا معاف طبیعت خراب تھی

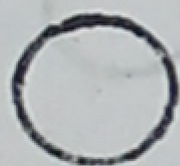
جو ظلم تھا وہ حسبِ سلیقہ درست تھا
جو بات تھی وہ اپنی جگہ لاجواب تھی

کیوں التفاتِ زیست کا احساں نہ مانیے
ہنستی ہوئی سی ایک شبِ ماہتاب تھی

مجبور ہو کے شیشۂ مے میں بدل گئی
ڈرتی ہوئی سی اک نظر انتخاب تھی

لہرا کے آئی اور کھنک کر گذر گئی
رُت تھی شباب کی کہ نوائے رباب تھی

فردِ عمل میں جس کا حوالہ تھا اے عدم
وہ میں نہیں تھا مستیٔ عہدِ شباب تھی



زندہ دلی کو کثرتِ افکار کھا گئی
بنیاد کے غرور کو دیوار کھا گئی

غائب ہے میرا نامۂ اعمال حشر میں!
رحمت تری متاعِ گنہ گار کھا گئی!

کتنے حسین تھے غمِ ہستی کے شعبدے
جو چشم باخبر تھی وہی مار کھا گئی

کچھ وہ ہیں جن کو کثرتِ افکار لے گئی
کچھ وہ ہیں جن کو فرصتِ بیکار کھا گئی

کس درجہ بدلحاظ تھی منحوس زندگی
ہر ہمدم عزیز کو مُردار کھا گئی

رکھتے تھے ہم بھی جنسِ دلِ بے بہا عدمؔ
لیکن اُسے نگاہِ خریدار کھا گئی!



ذرا سی لطف فرمائی ہوئی ہے
ابھی بدلی کہاں چھائی ہوئی ہے

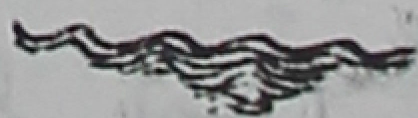
یہ کیوں ہم کو پریشاں کر رہے ہو
یہ کیا تکلیف فرمائی ہوئی ہے

بڑی گنجائشیں ہیں ڈوبنے کی
جوانی میکدے لائی ہوئی ہے

بڑی بے لذتی سے جی رہے تھے
خدا کا شکر رسوائی ہوئی ہے

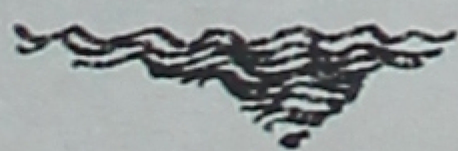
مجھے ترغیبِ موسیقی نہ دیجے
مرے بربط کو چوٹ آئی ہوئی ہے

عدم صرف اپنی نادانی ہے جس نے
ہمیں تکلیف پہنچائی ہوئی ہے!





خرد کے دام میں جو آ گئے ہیں
وہ دانش مند دھوکہ کھا گئے ہیں
ابھی تو فصلِ گُل کی ابتدا تھی!!
نہ جانے پُھول کیوں مُرجھا گئے ہیں!
کچھ ایسے آپ نے پھیری ہیں آنکھیں
زمانے کے سِتم شرما گئے ہیں
تری آنکھوں کی فرمائش پہ انساں
فریبِ زندگی بھی کھا گئے ہیں
عدمؔ سے زندگی رُوٹھی ہوئی تھی!
خُدا کا شُکر آپ آ گئے ہَیں!

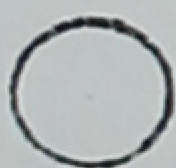




سازآتے ہیں جام آتے ہیں
کیسے کیسے مقام آتے ہیں
تم نہ آئے تو کوئی بات نہیں
لوگ لوگوں کے کام آتے ہیں

ایسے آتی ہیں یاد وہ زلفیں!
جیسے لمحاتِ شام آتے ہیں
چند لوگوں سے کچھ عقیدت تھی
چند لوگوں کے نام آتے ہیں

جب بھی آتے ہیں وہ عدم دل میں
کتنے محشر خرام آتے ہیں!



ان سے گفت و شنید ہو جاتی
بد ظنی کچھ مزید ہو جاتی!
شکر ہے ذکر مدعا نہ چھڑا
بھول کوئی جدید ہو جاتی
تم نے اچھا کیا نگاہ نہ کی
عادتِ بازدید ہو جاتی
حُسن ظن سے نہ کام گر لیتے
بدگمانی شدید ہو جاتی!
میکدہ بند ہے عدمؔ ورنہ
رخصت شب کو بھی عید ہو جاتی



محبت کو کہاں فکرِ زیان و سود ہوتا ہے
یہ دروازہ ہمارے شہر میں مسدود ہوتا ہے

مرے احساس کی تخلیق ہے جو کچھ بھی ہے ساقی
جسے محسوس کرتا ہوں وہی موجود ہوتا ہے

یہاں تک کھینچ لائی ہے مروت غمگساروں کی
کہ اب جو درد اُٹھتا ہے وہ لامحدود ہوتا ہے

خرد بھی زندگی کی کہکشاں کا ایک ستارہ ہے
مگر یہ وہ ستارہ ہے جو نامسعود ہوتا ہے

خدا کا نام تو ہے مفت میں بدنام اے ساقی
عبادت کرنے والا آپ ہی معبود ہوتا ہے

عدمؔ جب بھی میں تنہائی میں اسکو یاد کرتا ہوں!
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ موجود ہوتا ہے



چٹکتا ہی نہیں دل، آنکھ جب تک نَم نہیں ہوتی!
وہاں غنچے نہیں کھلتے جہاں شبنم نہیں ہوتی

اگر ہوتی ہے کچھ تو تیری بے ترتیب زلفوں سے
بغیر اس کے کبھی آرائشِ عالم نہیں ہوتی

نہایت بیش قیمت آفتوں میں آ پھنسا ہے دل
خدا راضی نہیں ہوتا خودی برہم نہیں ہوتی

ارے او چارہ سازو! کیا تکلّف کر رہے ہو تم!
جہاں ہم ہوں وہاں گنجائشِ مرہم نہیں ہوتی

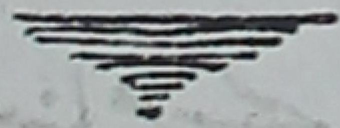
ترنّم میں کبھی ہوتی تو ہے اِک دلبستگی لیکن
خموشی میں وہ موسیقی ہے جو برہم نہیں ہوتی

مَسرّت کا عدم احساس ہی ممکن نہیں جب تک
طبیعت آشنائے اہتزازِ غم نہیں ہوتی



ستارے بیخود و سرشار تھے کل شب جہاں میں تھا!
اندھیرے رو کش انوار تھے کل شب جہاں میں تھا
مسائل زندگی کے جو کبھی سیدھے نہ ہوتے تھے
سراسر سہل اور ہموار تھے کل شب جہاں میں تھا
اگرچہ محتسب بھی اَن گنت تھے اس شبستاں میں
مگر سب میکشوں کے یار تھے کل شب جہاں میں تھا
جوانی محوِ آرائش تھی پوُری خود نمائی سے
دو عالم آئینہ بردار تھے کل شب جہاں میں تھا!
گدازِ قربتِ اصنام سے دل پگھلے جاتے تھے
نفس صہبا بدن گلنار تھے کل شب جہاں میں تھا
گماں ہوتا تھا شاید زندگی پھولوں کا گجرا ہے
گلوں کے اس قدر انبار تھے کل شب جہاں میں تھا

طلب میں جن کی عمریں صرف کردیں دیر و کعبہ میں
وہ مہ پیکر گلے کا ہار تھے کل شب جہاں میں تھا!
جبینوں کی دمک، زلفوں کی ٹھنڈک، جسم کی خوشبو
غرض یہ ہے بڑے غمخوار تھے کل شب جہاں میں تھا
صدا دی تھی غمِ دوراں کو لیکن کون آتا تھا!!
نگار و مطرب و مے خوار تھے کل شب جہاں میں تھا
فرشتے تو فرشتے ہیں مشیت کے ارادے بھی
مری تعظیم کو تیار تھے کل شب جہاں میں تھا
عدمؔ مت پوچھ کیا کیفیتیں تھیں ذہن پر طاری
نشاطِ روح کے معمار تھے کل شب جہاں میں تھا!





جنابِ شیخ تمہیں کیسی بدگمانی ہے
سبو میں مے تو نہیں گلستاں کا پانی ہے

تم اور اپنی کشادہ دلی سے پیش آؤ
میں سوچتا ہوں ستم ہے کہ مہربانی ہے

ترے جھکتے ہوئے گیسوؤں کی لہروں میں
مرے جوان خیالات کی روانی ہے

حباب ٹوٹ رہا ہے کچھ اس تکلف سے
کہ جیسے اسکی گرہ میں کوئی کہانی ہے

علاج دو ہی مسلّم ہیں شدّتِ غم کے
شرابِ ناب ہے یا مرگِ ناگہانی ہے

بڑی اداس بڑی مضمحل بہت غمگیں
مرا خیال ہے شاید مری جوانی ہے

یہ کائنات تری اے طلسمِ بندِ ازل
بڑی حسین ہے لیکن بہت پرانی ہے

ہمارے گھر کو یہ رونق کہاں میسّر ہے
حضور آپکے قدموں کی مہربانی ہے

وہ چیز جس سے چٹکتے ہیں غنچہ ہائے خیال
سنا ہے رنگِ عدم اس کا ارغوانی ہے



یہ معجزہ بھی خریدار کرنے والے ہیں
تجھے نمائشِ بازار کرنے والے ہیں

ہماری توبہ سے اتنا تو فائدہ نہ اُٹھا
تو جانتا ہے ہم انکار کرنے والے ہیں

جو زخم کھائے تھے تری حفظِ آبرو کے لئے
وہ اک خطا بھی ہم اے یار کرنیوالے ہیں

یہ لوگ جو نظر آتے ہیں سیدھے سادے سے
یہ لوگ تو بڑی تکرار کرنے والے ہیں

یہ کاروبار جو کرتے ہیں صاحبانِ خرد
یہ کاروبار تو بیمار کرنے والے ہیں

ذرا ادائیں تو دیکھو ستم ظریفوں کی
یہ لوگ چارۂ آزار کرنے والے ہیں

یہ جام جو نظر آتے ہیں آج گردش میں
مزاجِ دہر کو ہموار کرنے والے ہیں

ہمارے پاس کبھی آ بے تکلفی سے کبھی
بڑے خلوص سے ہم پیار کرنیوالے ہیں

ہر ایک درد کو درمان دینے والے ہیں
ہر ایک دشت کو گلزار کرنیوالے ہیں

ستا لیا ہے بہت اس کی رحمتوں کو عدمؔ
اب اپنے جرم کا اقرار کرنے والے ہیں



یہ بھی کوئی بات ہوئی
صبح ڈھلی تو رات ہوئی

دیوانے تو تب مانیں گے
جب کھل کر برسات ہوئی

ساقی کتنے دور چلے!
ساقی کتنی رات ہوئی

جام چلا تو تب جا کر
ترمیمِ حالات ہوئی

اس کی شکایت کیا کیجئے
وہ تو خدا کی ذات ہوئی

آج عدمؔ کچھ تفریحاً!
اُن سے پرانی بات ہوئی



اس کی آنکھوں میں جو دیکھا ہے خرابات کا رنگ
جھوم اُٹھا ہے مرے مست خیالات کا رنگ

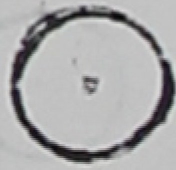
وہ تو گیسو ترے اے یار بکھر جاتے ہیں
ورنہ کب پوری طرح کھلتا ہے برسات کا رنگ

رنگ ہی رنگ تھا بکھرا ہوا ہر سو دل میں
ہائے اس جانِ بہاراں کی ملاقات کا رنگ

زندگی آج ملی ہے ہمیں ایسے ہنس کر
جس طرح چشمِ حسیناں میں مدارات کا رنگ

نہ تبسم، نہ ترنّم، نہ ستارہ، نہ سبو!!
جھوم اُٹھا دیکھ کے میں صورتِ حالات کا رنگ

آج کچھ اور ہی عالم ہے طبیعت کا عدم
کھُل نہ جائے کہیں بنتی ہوئی برسات کا رنگ



حدیثِ سلسلۂ زلفِ یار ختم ہوئی
خزاں چمن میں در آئی بہار ختم ہوئی

خدا کرے لبِ جُو پھر وہ منعقد ہو کبھی
جو بزمِ شوق لبِ جوئبار ختم ہوئی

اُٹھا کے پھینک دو خوش رنگ آبگینوں کو
بہارِ میکدۂ اعتبار ختم ہوئی

کہاں تھی موسمِ گل کو قیام کی فرصت
بھر اٹھا جام کہ فصلِ بہار ختم ہوئی

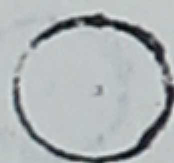
مرا سفر تو ہوا ختم تیری چوکھٹ پر
تری تلاش کہاں اے نگار ختم ہوئی

وہی سفر ہے وہی درد ہے وہی وحشت
خبر نہیں کہ کہاں رہگذار ختم ہوئی

مرے حواس میں بھی پھینک دو کوئی کانٹا
مجھے یقین نہیں آتا بہار ختم ہوئی

ہے صبحِ حشر بھی دل کو عدمؔ یہی حسرت
کوئی کہے کہ شبِ انتظار ختم ہوئی





شراب ملتی ہے اور بے حساب ملتی ہے
بروزِ تشنگی کامیاب ملتی ہے

ہزار خوابِ حسیں جب تباہ ہو جائیں
تو پھر کہیں کوئی تعبیرِ خواب ملتی ہے

ہزار تشنہ امنگیں ہوں جب شکارِ اجل
تو ایک لرزشِ موجِ سراب ملتی ہے

سمٹ کے خونِ جگر جب نگاہ بن جائے
تو پھر کوئی نظرِ انتخاب ملتی ہے

طویل عمر میں ہر شخص کو بصورتِ شمع
بس ایک رات بہت کامیاب ملتی ہے

ملے اگر کبھی بھولے سے زندگی ساقی
تو کس خلوص سے خانہ خراب ملتی ہے

یہ کیا غضب ہے کہ شبنم کی ٹھنڈکوں میں بھی
حرارتِ نفسِ آفتاب ملتی ہے

دکھائی دُور سے دیتے ہیں جانفزا چشمے
قریب جاؤ تو موجِ سراب ملتی ہے

نظر خراب حقیقت نہیں غلامؔ ورنہ
گلی گلی کی بغل میں کتاب ملتی ہے





مرنے والے تری جوانی پر — کر گئے لطف زندگانی پر
صبح محشر بھی ہوگئی قرباں — تری ڈھلتی ہوئی جوانی پر
کیوں کسی کی اُمید پر جینا — کیا بنانا مکان پانی پر
ہنس پڑی دوجہاں کی وحشت — اہل دانش کی نکتہ دانی پر
پھینک دے پھر کمندِ زلفِ صنم — اے عدم وقت کی روانی پر



آپ جب باغ سے رواں ہونگے — پھول ہونگے نہ گلستاں ہونگے
آپ آتے نہیں غنیمت ہے — آپ آئے تو ہم کہاں ہونگے
ذکرِ محشر مبالغہ تو نہیں — واقعی آپ بھی وہاں ہونگے
مٹ گئے جو تری جوانی پر — دوسری بار کیا جواں ہونگے
خلد جن سے عدم عبارت ہے
ایک دو جامِ ارغواں ہوں گے



روح پرور نام اور القاب یاد آنے لگے
جام و مینا مطرب و مضراب یاد آنے لگے

عنبریں زلفوں کے سائے احمریں ہونٹوں کے رس
زندگی کے قدرتی اسباب یاد آنے لگے

سانحاتِ خوشنما کی ٹیس اُٹھی جھوم کر
واقعاتِ دلکش و شاداب یاد آنے لگے

بھول جانے کی ہر اک سعی جواں کے باوجود
بے مروت بے وفا احباب یاد آنے لگے

پھر مسلسل گیسوؤں کے شبکدوں کی اوٹ میں
آفتاب آرائیوں کے خواب یاد آنے لگے

پھر وہ پہلی ظلمتوں کے حلقۂ جاں بخش میں
اُجلے اُجلے مرمریں آداب یاد آنے لگے

روح میں پھر اسطرح جاگا محبت کا کنول
چاند یاد آنے لگے مہتاب یاد آنے لگے

جسم و جاں ہونے لگے محسوس لحنِ آبجو
ہوش و دانش رنگ میں غرقاب یاد آنے لگے

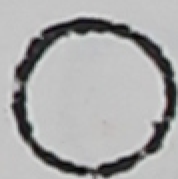
گل صفت اجسام کے احساس زیر و بم عدم
صورتِ موسیقیٔ اعصاب یاد آنے لگے



کس قدر مجبور ہوں میں کس قدر مختار ہوں
دامِ ہستی میں اَدائے التفاتِ یار ہوں
میں فقط حُسنِ تکلّم ہی سے زخمی ہو گیا
زندگی اِک روز کہہ بیٹھی کہ میں تلوار ہوں
کاش ڈھل جاؤں تری خاطر کسی ترتیب میں
یوں تو اِک بکھرا ہوا مجموعۂ افکار ہوں
آج اتنی اجنبیّت مت برتیے گا حضُور
آج میں ہر ہر جج پر آمادۂ تکرار ہوں
زندگی سے پیار کرنا گر مرض ہے اے عدمؔ
پھر تو یہ کہیئے کہ میں اِک مستقل بیمار ہوں!



نین جام بن گئے
نیک کام بن گئے
زُلف و رُخ کے ربط سے
صبح و شام بن گئے
خود ہی دِل لُبھا لیا
خود ہی دام بن گئے
جن سے ربطِ خاص تھا
وہ بھی عام بن گئے
مے کے قحط سے عدمؔ
زخم جام بن گئے



رنگ خوب کھُل گیا
سب غُبار دُھل گیا
میکدہ اُداس ہے
میکشوں کا غُل گیا
گلستاں خموش ہے
دَورِ جام رُل گیا
یوں گیا وہ مہ جبیں!
جیسے عہدِ گُل گیا
شب بخیر اے عدم
میکدہ تو کھُل گیا!



اک داستاں میں محفل ہستی بکھر گئی
کیا مختصر سی رات تھی کیسے گذر گئی

مت پوچھ اضطراب جوانی کا ماجرا
برسات کی ندی تھی کہ چڑھ کر اتر گئی

بادل گھرے کہ روح میں ٹھنڈک سی آ گئی
ساغر اٹھا کہ گردش شام و سحر گئی

ساقی یہ پُر فریب تبسم تو زہر ہیں
ساقی وُہ پرخلوص مسّرت کدھر گئی

عمرِ زوال تلاشِ مسّرت میں اے عدم
ایسے گئی کہ آپ بھی کم بخت مر گئی



بیتے ہوئے دنوں کی کوئی بات چھیڑ دے
زلفیں بکھیر اور حکایات چھیڑ دے
غمہائے روزگار کی نیت خراب ہے
چھکے سے اٹھ کے ساز خرابات چھیڑ دے
ایسی کمند پھینک جو رحمت کو کھینچ لائے
ایسی نگاہ ڈال جو برسات چھیڑ دے
مدت ہوئی ہے رقص عقیدت کئے ہوئے
پھر کوئی رنگ بار مناجات چھیڑ دے
کٹتی ہے زندگی انھیں حیلوں سے اے عدم
بیٹھا ہے کیوں خموش، کوئی بات چھیڑ دے



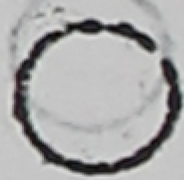
خلوصِ کفر سے ایماں کدہ ایجاد ہوتا ہے
سُنا ہے دل کے مندر میں خدا آباد ہوتا ہے

جنوں کے زیرِ سایہ زندگی پروان چڑھتی ہے
یہ وہ موسم ہے جو ہر رُت میں گُل ایجاد ہوتا ہے

یہاں کیا فائدہ اے دوست جوئے شیر لانے کا
یہاں ہر روز خونِ محنتِ فرہاد ہوتا ہے

بسا اوقات تیری یاد بھی تسکیں نہیں دیتی
بسا اوقات تو دل اس قدر ناشاد ہوتا ہے

عدمؔ وہ لب جو مے سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں
ہمیں یہ دیکھنا ہے ان سے کیا ارشاد ہوتا ہے



کسی کے لب پہ جب اُس بے وفا کا نام آتا ہے
طبیعت کو بڑا تکلیف دِہ آرام آتا ہے

نگاہِ بے محابا ڈال دے ادراکِ ہستی پر
کہ میری میکشی پر ہوش کا الزام آتا ہے

محبت کے فسانے کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے
اِدھر آغاز ہوتا ہے اُدھر انجام آتا ہے

بڑی تاخیر سے تسکین کے اسباب بنتے ہیں
بڑی تکلیف سے ساقی لبوں تک جام آتا ہے

سیہ گیسو، سیہ آنچل اور اُن میں پھول سا چہرہ
تصور آپ کا مثلِ ورودِ شام آتا ہے

گزارا کس طرح ہوگا نہ جانے اہلِ دُنیا سے
نہ کوئی بات آتی ہے نہ کوئی کام آتا ہے

نظر ڈوبی ہوئی، رُخ مضمحل، رفتار افسردہ
عدم آتا ہے یا اک سایۂ آلام آتا ہے



جب نئی رسم و راہ ہوتی ہے
بدظنی گاہ گاہ ہوتی ہے

میری سرکار آپ واقف ہیں
یوں تو مشکل نباہ ہوتی ہے

دیکھ لو ربطِ شمع و پروانہ
دوستی بے پناہ ہوتی ہے

میکدے سے ذرا پرے ہٹ کر
راہ کتنی سیاہ ہوتی ہے

اور ہوتا ہی کیا ہے او ظالم
ایک ہی تو نگاہ ہوتی ہے

زندگی ایسے اُجڑ گئی ہے عدم
جیسے اک خانقاہ ہوتی ہے



جستجو مدعائے ہستی کی
بات ہے انتہائے مستی کی

کر دیا خوش خدا کو بھی ہم نے
اس عقیدت سے بت پرستی کی

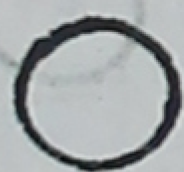
جب سے رخصت ہوا ہے غم دل سے
رونقیں مٹ گئیں ہیں بستی کی

لے گئیں اُن دراز زلفوں تک
اُلجھنیں واقعات ہستی کی

ہم فقیروں سے بھی عدم اکثر
زندگی نے دراز دستی کی



جو بھی کرنا ہے آب و تاب سے کر
مشورہ ماہ و آفتاب سے کر
گفتگو کا حساب ہوتا ہے!
ناصحا! گفتگو حساب سے کر
انتہا کی خبر نہیں معلوم!
ابتدا ساغرِ شراب سے کر
دیر و کعبہ پہ برق گرتی ہے
بات مت گوشۂ نقاب سے کر
دِل کی تکلیف کا علاج عدمؔ
نغمہ و نکہت و شراب سے کر



دل نے کھینچی ہے تری زُلف کے سر ہونے تک
وہ جو قطرے پہ گذرتی ہے گہر ہونے تک

پہلا احساسِ طرب ہی الم افزا نکلا
دیکھیں کیا حال ہو احساسِ دگر ہونے تک

لا مئے ناب کہ شادابیٔ گل ہائے خیال
رو کھ جائے نہ بہاروں کا گذر ہونے تک

شمع ہی پر نہیں موقوف مئے و نغمہ و گل
سرد ہو جاتی ہے ہر چیز سحر ہونے تک

ہم کو پہچان ہی لے گی کبھی رحمت تیری
عیب کو وقت ہے درکار ہنر ہونے تک

بعد اس کے کوئی تقریب نہیں ہے غم کی
آج تم پاس رہو میرے، سحر ہونے تک

تم کو ناحق یونہی تکلیفِ خبر کیا دینا
ہم کو رہنا ہی نہیں تم کو خبر ہونے تک
وقت سے پہلے بھی کٹ جاتی ہے مہلت غم کی
شمع ہر رات نہیں جلتی سحر ہونے تک
کتنی مستی تھی عدم غنچہ و گل پر طاری
گلستاں میں مری تردیدِ نظر ہونے تک



میں بھی نادم نہ ہوا وہ بھی پشیماں نہ ہوا
فائدہ کچھ نہ ہوا تو کوئی نقصاں نہ ہوا
ایک ہی بار تری شکل کا عرفاں تھا محال
دوسری بار کوئی آئینہ حیراں نہ ہوا
چند ایسی بھی تھیں روٹھی ہوئی کلیاں جن کو
موسمِ گل میں بھی احساسِ بہاراں نہ ہوا

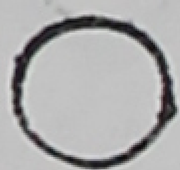
عمر بھر طنز سے جینے ہی نہ دیتی دُنیا
خیر گذری کہ مرے گھر میں وہ مہماں نہ ہُوا

آہ وہ عزّت ہستی جو رہی اپنی اسیر
ہائے وہ قطرہ جو منّت کشِ طوفاں نہ ہُوا

دِل کی تکلیف کے درماں تو بہت تھے لیکن
میں کسی آنکھ کا شرمندۂ احساں نہ ہُوا

میریؔ برباد محبّت کی حقیقت مت پوچھ
ایک تصویر تھی جس کا کوئی عنواں نہ ہُوا

کون سی آس تھی بر آئی جو ہستی میں عدم
کون سا خواب تھا جو خوابِ پریشاں نہ ہُوا



نور بنے ہو نار بنے ہو
کیا کیا کچھ سرکار بنے ہو

کل تک تو بیزار تھے ہم سے
آج گلے کا ہار بنے ہو

تب کتنا آسان تھا ملنا
اب کتنے دشوار بنے ہو

سرتاپا آہنگِ بہاراں
نغمے کی جھنکار بنے ہو

روٹھ نہ جائے صبحِ قیامت
کیوں اتنے ہموار بنے ہو

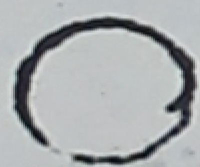
غم سے ناواقف ہو شاید
کیوں مرے غمخوار بنے ہو

جھوم رہے ہو ڈول رہے ہو
مستی کا کردار بنے ہو

اپنوں سے بھی اتنا تکلف
کتنے دنیا دار بنے ہو

صحتِ دوراں سجدہ فشاں ہے
کیا بانکے بیمار بنے ہو

کون عدمؔ وہ شاعر رسوا
کیا اب اُس کے یار بنے ہو



جہانِ ہوش میں جامِ شراب لایا ہوں
جہاں چراغ نہ تھا۔ آفتاب لایا ہوں
سُنا تھا ٹوٹے ہوئے ساز خوب بجتے ہیں
بڑے خلوص سے دِل کا رُباب لایا ہوں
خلوص گو بڑی ارزاں سی چیز ہے لیکن
جو ہو سکا ہے مجھے دستیاب لایا ہوں
بناوٹوں کے کھلونے نہیں ملے مجھ کو
دلِ تباہ و نگاہِ خراب لایا ہوں
نہ پُوچھ، کتنے بھٹکتے ہوئے اندھیروں کو
دعائیں دے کے شب ماہتاب لایا ہوں
تڑپ اُٹھی ہیں عدم حکمتیں دو عالم کی
کہیں سے جب کبھی ذرا سی شراب لایا ہوں



رنجِ بے کیفیِ حیات نہیں
آپ خوش ہیں تو کوئی بات نہیں

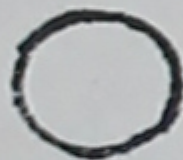
سوچیئے تو ہزار باتیں ہیں
غور کیجیئے تو کوئی بات نہیں

تذکرے ہیں خلوص کے جن میں
داستانیں ہیں واقعات نہیں

فکر ہو جن کے ٹوٹ جانے کی
اُن سے ایسے تعلقات نہیں

ذکر ہے گردشِ زمانہ کا
آپ کی انکھڑیوں کی بات نہیں

کتنی شمعیں عدم جلا ڈو گے
زندگی گرمیوں کی رات نہیں

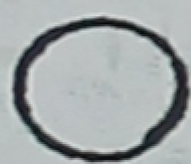


اعتبارِ وفا نہیں کرتے
لوگ کوئی خطا نہیں کرتے
حشر کا کون اعتبار کرے
آپ وعدہ وفا نہیں کرتے
بات کرتے ہیں اہلِ دنیا کی
آپ کا تو گِلا نہیں کرتے
اب جفا کی بہت ضرورت تھی
اب وہ کوئی جفا نہیں کرتے
ہم تو بدنام ہیں عالم یونہی
لوگ دُنیا میں کیا نہیں کرتے

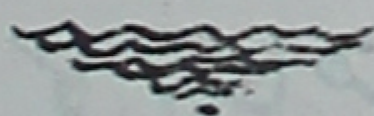


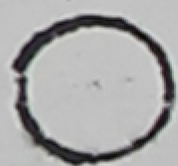


صد ہا تکلفات کے بعد اِک نظر اُٹھی
بھرپور اُٹھی اگرچہ بہت مختصر اُٹھی
اُٹھی، وہ چشم مست کچھ اس احتیاط سے
کوئی نہ کر سکا یہ تعیّن کدھر اُٹھی
ساغر چلا ہی تھا کہ بہاریں مچل پڑیں
گیسو کھلے ہی تھے کہ گھٹا جھوم کر اُٹھی
کُھلنا نہ تھا نگاہ کا مطلب مگر کُھلا!
اُٹھتی نہ تھی شراب کی تہمت مگر اُٹھی
اُٹھی ہماری سمت بھی وہ آنکھ بارہا
لیکن ہر ایک بار برنگِ دگر اُٹھی
دنیا سے آب و رنگ کا چہرہ اُتر گیا
جب بھی مری نگاہِ حقیقت نگر اُٹھی
میں اور شکستِ توبہ کا اتنا جنوں علیم
وہ یہ ہوا کہ جام سے پہلے نظر اُٹھی

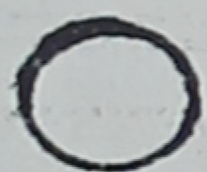


ہے کس کا انتظار مجھے کچھ خبر نہیں
کب آئے گی بہار مجھے کچھ خبر نہیں
میں دیکھتا ہوں تم کو یونہی برسبیلِ شوق
کہتے ہیں کس کو پیار مجھے کچھ خبر نہیں
تیری نگاہ، میری تمنّا، کہ زندگی
ہے کون میگسار مجھے کچھ خبر نہیں
آواز کس نے دی تھی تجھے فرطِ شوق سے
اے دخترِ بہار! مجھے کچھ خبر نہیں!
جاتی ہے کس حسین کی منزل کو اے عدم
ہستی کی رہ گذار مجھے کچھ خبر نہیں!





دور میں آسمان ہے پیارے — کچھ ہمارا بھی دھیان ہے پیارے
میرے نقصان کا خیال نہ کر — زندگی اک زیان ہے پیارے
کیا چمکتے فریب بکتے ہیں — کتنی اُجلی دکان ہے پیارے
چھوڑ کر تجھ کو کس طرف جائیں — جان ہے تو جہان ہے پیارے
سوچ لے اب بھی کچھ نہیں بگڑا — وقت کچھ درمیان ہے پیارے
کون مرگِ حسیں پہ مرتا ہے — آرزو نوجوان ہے پیارے
بات کی آبرو نہ کھو بیٹھے — لڑکھڑاتی زبان ہے پیارے
معتدل رکھ کلام کا لہجہ! — عاشقوں کی بھی آن ہے پیارے
ہم غریبوں کا کچھ نہیں اس میں — سب تری داستان ہے پیارے
میکدے پر نگاہ تو فرما — کیسا دارالامان ہے پیارے
زندگی تیر کیا چلائے گی — اک شکستہ کمان ہے پیارے
اب تو کوئی بھی درمیان نہیں — کون اب درمیان ہے پیارے
زندگی کیا مسافروں کی نعیم — ایک اُٹھتی سی تان ہے پیارے



سحر کی دعا کا جواب آ گیا
مرے ہاتھ میں آفتاب آ گیا

سبو تو اُٹھا ہی لیا تھا مگر
تری انکھڑیوں سے حجاب آ گیا

گھٹاؤں کے بننے میں وقت ہی کیا
وہ گیسو کھلے اور سحاب آ گیا

خیالات تو اتنے کافر نہ تھے
خیالات میں انقلاب آ گیا

وہ پہلے ہی تصویر سے کم نہ تھے
مگر اب تو عہدِ شباب آ گیا

ارے او مرے مالکِ زندگی!
ترے لطف کو بھی حساب آ گیا

اُنہیں شوقِ نغمہ تھا شاید علیم
کہ دِل میرا بن کر رباب آ گیا



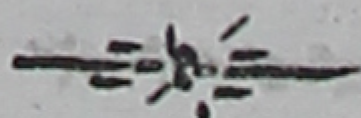
سو کے جب وہ نگار اُٹھتا ہے
مثلِ ابرِ بہار اُٹھتا ہے

تیری آنکھوں کے آسرے کے بغیر!
کب غمِ روزگار اُٹھتا ہے

ایسے جاتی ہے زندگی کی اُمید
جیسے پہلو سے یار اُٹھتا ہے

آج کی رات خیر سے گذرے
دردِ دل بار بار اُٹھتا ہے

ہوش میں ہو تو میکدے سے عدمؔ
کب کوئی بادہ خوار اُٹھتا ہے





گیسوؤں کے اسیر ہو جائیں
آؤ ان کے فقیر ہو جائیں

کتنے دلکش ہیں زندگی کے ستم!
آرزو ہے کہ تیر ہو جائیں

میں کہیں راستہ نہ کھو بیٹھوں
آپ میرے مشیر ہو جائیں

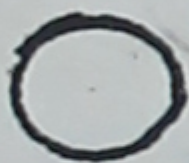
آپ اگر گیسوؤں کو پھیلا دیں
سلسلے بے نظیر ہو جائیں

دیکھ کر اُنکی انکھڑیوں کو عدمؔ
آبگینے فقیر ہو جائیں



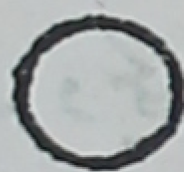
ستم دستور ہوتے جا رہے ہیں
وہ ہم سے دُور ہوتے جا رہے ہیں
نقاب اُلٹی ہے کس زہرہ جبیں نے
اندھیرے نور ہوتے جا رہے ہیں
نہ جانے کیا خطا سرزد ہوئی ہے
خُدا مغرور ہوتے جا رہے ہیں
دلوں کو پُھول بننے کی ہوس تھی
مگر ناسور ہوتے جا رہے ہیں
خلوص اتنا فراواں ہو گیا ہے
اثر کافور ہوتے جا رہے ہیں
عدمؔ اُن انکھڑیوں کا ذکر سُن کر
پیالے چور ہوتے جا رہے ہیں





ستم کی حد بھی اک قیمتی تدبیر ہے ساقی
مروّت بھی فقیروں کے لئے شمشیر ہے ساقی
سُنا تھا زندگی اِک غنچۂ نورستہ ہے لیکن
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نوکِ تیر ہے ساقی
اِسی کہنہ یقیں پر ہے مدارِ دو جہاں اب بھی
خودی تدبیر ہے ساقی، خدا تقدیر ہے ساقی
میں جاہل ہوں مگر اُس مدرسے کا طفلِ مکتب ہوں
جہاں صرف آدمیت لائقِ توقیر ہے ساقی
سمجھنے والے اس حد تک تو اب تسلیم کرتے ہیں
مِری مستی تری برہم شدہ تقدیر ہے ساقی
ہر ایک الزام کے دو غیر فانی رنگ ہوتے ہیں
تری تصویر میں شامل مری تصویر ہے ساقی

پلا مئے اور حقیقت دیکھ لے اربابِ محفل کی
کہ مئے انسان کے اخلاق کی تفسیر ہے ساقی
مرے ماحول کو تبدیل کر دے اپنی آنکھوں سے
سُنا ہے آدمی ماحول کی تعمیر ہے ساقی
سرِ بازار کرنے دے عدمؔ کو رقصِ مستانہ
جوانی اِک مکمّل لذّتِ تشہیر ہے ساقی



دردِ دل اب تو عام ہوتا ہے
رات دن صبح و شام ہوتا ہے

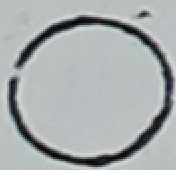
میکدے کا معاملہ مت پوچھ
آہ کیا انتظام ہوتا ہے

جنکی قسمت میں پیچ ہوں ان کو
تیری زلفوں سے کام ہوتا ہے

اُس کے ہاتھوں میں کیا نہیں ہوتا
جس کے ہاتھوں میں جام ہوتا ہے

اسکی آنکھوں کا تذکرہ مت کر
خونِ صہبا و جام ہوتا ہے

بے سبب کب کوئی کسی سے عدمؔ
راہ میں ہمکلام ہوتا ہے



دامن و جیب تار تار نہیں
شکر ہے موسمِ بہار نہیں!

کتنی مجبوریاں ہیں دنیا میں
اپنے دل پر بھی اختیار نہیں

میرے ہمدم مرے قریب نہ آ
میرا ماحول خوشگوار نہیں

آپ کی خوبصورتی کی قسم!
آپ کا کوئی اعتبار نہیں

بُجھ چکی ہے ہر اک اُمید عدمؔ
اب طبیعت پہ کوئی بار نہیں



بہار آتی ہے جب ٹھنڈی ہوا تکلیف دیتی ہے
پیالوں کے کھنکنے کی صدا تکلیف دیتی ہے
اگرچہ اک زمانہ ہوگیا قطع مراسم کو!
تمہاری یاد اب بھی بارہا تکلیف دیتی ہے
اگر تکلیف جائز ہو تو ہم سہہ لیں خموشی سے
گِلا یہ ہے کہ دنیا ناروا تکلیف دیتی ہے
یہ متوالی گھٹا جو آج ساقی عینِ رحمت ہے
بسا اوقات یہ کالی گھٹا تکلیف دیتی ہے
دُعا اک آخری تدبیر ہے جھوٹی تسلی کی!
دعا کرتا تو ہوں لیکن دعا تکلیف دیتی ہے
محبت ایک بیماری ہے لیکن لوگ کہتے ہیں!
یہ بیماری بڑی راحت فضا تکلیف دیتی ہے
خرد مندوں کی محفل میں نہ لے جا اے عدمؔ ہم کو
ہمیں اس بزم کی آب و ہوا تکلیف دیتی ہے



غمِ زندگی مسکراتا رہے گا
حسینوں سے مِلتا ملاتا رہے گا
اُٹھا ساغرِ مے، نہ کر فکرِ دوراں
زمانہ ہے چلتا چلاتا رہے گا!
ابھی انعقادِ قیامت نہ کیجئے
یہ جھوٹا سہارا ابھی جاتا رہے گا
ہماری نہ تشویش کر کوئی ساقی
ہمیں خود بخود ہوش آتا رہے گا
عدمؔ دل کو چسکا ہے آوارگی کا
اسے جتنا روکو گے جاتا رہے گا



اُٹھا جام اور چھیڑ کوئی فسانہ
کہ ناساز ہے کچھ مزاجِ زمانہ
کوئی آبگینہ گرا دو زمیں پر
نہ کوئی تبسّم نہ کوئی ترانہ
بکھرتی چلی جا رہی ہیں بہاریں
گذرتا چلا جا رہا ہے زمانہ
وہیں کر لیا رہرووں نے بسیرا
جہاں مل گیا کوئی دلکش ٹھکانہ
عدمؔ بجلیوں کے تغافل سے جل کر
اگر حادثہ بن گیا آشیانہ



گرتے ہیں لوگ گرمئ بازار دیکھ کر
سرکار! دیکھ کر، میری سرکار دیکھ کر

یہ بھی ہے رہبروں کے کرم سے جلی ہوئی
ڈرتی ہے عقل راہ کو ہموار دیکھ کر

آوارگی کا شوق بھڑکتا ہے اور بھی
تیری گلی کا سایۂ دیوار دیکھ کر

کیا مستقل علاج کیا دل کے درد کا
وہ مسکرا دئے مجھے بیمار دیکھ کر

تسکینِ دل کی ایک ہی تدبیر ہے فقط
سر پھوڑ لیجئے کوئی دیوار دیکھ کر

آتا ہے دشمنوں کی مدارت کا خیال
احباب کا طریقۂ گفتار دیکھ کر

ہم بھی گئے ہیں ہوش سے ساقی کبھی کبھی
لیکن تری نگاہ کے اطوار دیکھ کر

لے آئی زیست کون و مکاں کی اذیتیں
مجھ کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

وہ کون تھا جہاں میں جو ہم کو خریدتا
ہم بک گئے خلوصِ خریدار دیکھ کر

دیکھا کسی کی سمت تو کیا ہو گیا عدمؔ
چلتے ہیں راہرو سرِ بازار دیکھ کر



نکلی ہے فالِ اہلِ خرد کی کتاب سے
اک جام قیمتی ہے جہانِ خراب سے

کرنا نہ بھول کر کبھی گستاخیٔ سوال!
ہوتا جو آشنا ہیں تمہارے جواب سے

کرتے ہیں موجِ مے سے سکونِ جگر کشید
شبنم نچوڑتے ہیں رگِ آفتاب سے

زلفیں بکھیر دے کہ زمانے کو علم ہو
ظلمت حسین تر ہے شبِ ماہتاب سے

اُٹھتی ہے سطحِ جام سے یوں مے کی چاندنی
نغمے کی لہر جیسے رواں ہو رباب سے

فردا کو چھوڑ آج ہی ایفائے عہد کر
بجھتی ہے تشنگی کہیں موجِ سراب سے

دیکھا ہے جب سے اُنکی نگاہوں کو اے عدمؔ
مانوس ہو گئی ہے طبیعت شراب سے



خرابات میں کیوں لے جا رہے ہو
یہ کیا قیمتی ظلم فرما رہے ہو
قیامت کا بازار کیا گرم ہوگا
نہ ہم جا رہے ہیں نہ تم آ رہے ہو
بڑے نکتہ رس ہو مرے خیر خواہ ہو
مجھے اُن کے بارے میں سمجھا رہے ہو
کسی ضابطے میں تو زلفوں کو لاؤ
نہ اُلجھا رہے ہو نہ سلجھا رہے ہو
غریبوں کے احوال پر ہنسنے والو
بڑی دلنوازی سے پیش آ رہے ہو
عدمؔ کسی متانت سے بیمار ہو کر
جواں گیسوؤں کی ہوا کھا رہے ہو



فضا ہنس رہی ہے ہوا گا رہی ہے
بڑی تمکنت سے بہار آ رہی ہے
ترے جسم کی چاندنی اللہ اللہ
مجھے صبحِ تخلیق یاد آ رہی ہے
نہ آواز دو میری عمرِ رواں کو
کوئی اور گھر ڈھونڈنے جا رہی ہے
نقاب اُن کے چہرے سے سرکا ہے شاید
بڑی دُور تک برق لہرا رہی ہے
غمِ زندگی کی حکایات سُن کر
عدمؔ آج ہم کو بھی نیند آ رہی ہے





وہ فرشِ سبزہ پہ یوں نرم گام چلتا ہے
کہ جیسے چرخ پہ ماہِ تمام چلتا ہے
اِدھر تو گردشِ ایام کیسے آ نکلی!
یہ میکدہ ہے یہاں دَورِ جام چلتا ہے
ترے فراق کے لمحے بسر نہیں ہوتے
اگرچہ وقت بہت تیز گام چلتا ہے
فریب دیجئے لیکن کسی سلیقے سے
دروغِ مصلحت آمیز عام چلتا ہے
نہ آنسوؤں کی کمی ہے نہ قحط آہوں کا
ترے کرم سے فقیروں کا کام چلتا ہے
پگھل ہی جائیں گے دل اے عدم حسینوں کے
کہ پتھروں پہ بھی سحرِ کلام چلتا ہے



فلک پہ رات کو جب ماہتاب ہوتا ہے
مرے سبو سے رواں آفتاب ہوتا ہے

تمہاری شکل کوئی کس طرح سے پہچانے
تمہارے رُخ پہ ہمیشہ نقاب ہوتا ہے

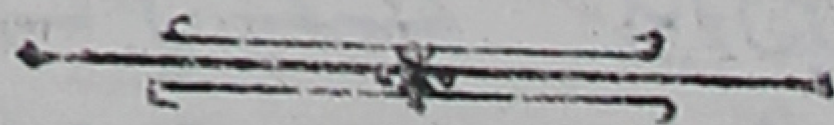
یہ برگِ زرد، یہ کہرا، یہ دھوپ کی کرنیں
خزاں کا روپ بھی کیا لاجواب ہوتا ہے

ہماری خانہ خرابی کی کوششیں کر کے
غمِ زمانہ بھی کتنا خراب ہوتا ہے

کلی چٹک کے پریشان ہوتی جاتی ہے
یہ واقعات میں کیا انقلاب ہوتا ہے

تم آنا چاہو تو مشکل نہیں کچھ آنے میں
زمانہ رات کو مصروفِ خواب ہوتا ہے

ہم اُن کے عشق میں ہیں اتنے غیر حال عدیمؔ
کہ جس طرح کوئی غرقِ شراب ہوتا ہے





وہ بیمار غنچے وہ غمگیں بہاریں — مری زندگی کی حسیں یادگاریں
میں آواز دیتا رہا ساقیوں کو — گزرتی گئیں زندگی کی بہاریں
ادھر آ غمِ زندگی چند لمحے — خرابات کی رونقوں میں گزاریں
کبھی ایسے لمحے پھر آئیں میسّر — میں ساغر اٹھاؤں وہ گیسو سنواریں
عدمؔ جل اٹھیں دیر و کعبہ کے پردے — خدا کو کسی روز ایسے پکاریں





وہی ابتلا ہے وہی بے کلی ہے — مگر خیر اک آرزو تو چلی ہے
بڑی دیر کے بعد مانا ہے دل نے — نہ مانے سے ناآشنائی بھلی ہے
صراحی سے ابھرے ہیں ڈوبے ستارے — پیالوں میں عمرِ گذشتہ ڈھلی ہے
ہوا کے تھپیڑوں کو نیند آ رہی ہے — نہ جانے کدھر آج کشتی چلی ہے
مجھے اے عدمؔ کیا اندھیروں کا کھٹکا — مرے جام میں چاندنی کی ڈلی ہے



افسانہ چاہتے تھے وہ افسانہ بن گیا
میں حسنِ اتفاق سے دیوانہ بن گیا!

جو زلف منتشر ہوئی زنجیر بن گئی
جو حرف مختصر ہُوا افسانہ بن گیا

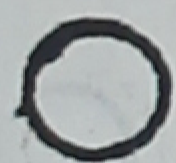
وہ اہتمام عشق کو تھا انتہائے عشق
کہ حُسن اختصار سے پروانہ بن گیا

دیوانگی کی شرط کچھ اتنی عجیب تھی
جس میں ذرا سی عقل تھی فرزانہ بن گیا

آیا تھا میرے ساتھ مگر مگر بد دماغ دل
موسم کا رنگ دیکھ کے بیگانہ بن گیا!

حیرت مجھے بھی ہے مگر اے چشم باخبر
کچھ تو ضرور ہوگا جو افسانہ بن گیا

سُن سُن کے رشک سے مرے حالات اے عدم
جو صاحبِ خرد تھا وہ دیوانہ بن گیا



یہ اختلافِ آب و ہوا کیا کمال ہے
کل دل بہت اُداس تھا امشب بحال ہے

اس قیمتی دروغ پہ گہری نظر نہ ڈال
دنیا نگار خانۂ خواب و خیال ہے

تجھ سے بھی زندگی نے کیا ہے وہی سلوک
اس حادثے کا مجھ کو ذرا سا ملال ہے

تکمیلِ جور کی بھی نہ ہمّت ہوئی تجھے
چھوٹی سی ایک تیرے کرم کی مثال ہے

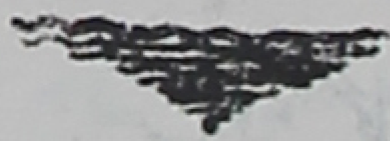
مجھ پر حضور چشمِ عنایت نہ کیجیے
میں مطمئن ہوں میری طبیعت بحال ہے

بیٹھے ہیں فرشِ گل پہ وہ زلفیں بکھیر کر
اور سر پہ شب خرام ستاروں کا جال ہے

کہتے ہیں میکدے کی ہوا ہے سرور بخش
کیوں اے غمِ حیات ترا کیا خیال ہے

جی چاہتا ہے دل اسی ظالم کو سونپ دوں
اور مسکرا کے پوچھوں کہو! کیسا حال ہے

تو میکدے میں آنکھ ملائے عدمؔ کے ساتھ
اے گردشِ زمانہ تری کیا مجال ہے





سازنہیں ہے جام نہیں ہے
رونق صبح و شام نہیں ہے

مے خانہ ہے سُونا سُونا
ساقیٔ گل اندام نہیں ہے

اے دل والو کیوں ڈرتے ہو!!
گیسوئے جاناں دام نہیں ہے

دل کا تماشہ دیکھ رہے ہیں
آپ سے کوئی کام نہیں ہے

یوں تو عدم خنداں ہے طبیعت !
دل کو مگر آرام نہیں ہے



ان کا تغافل کام نہ آیا
پیاس نہ بھڑکی جام نہ آیا
دل کا تجسس اب کیا کیجئے
صبح کا بھولا شام نہ آیا
اُف ری محبّت کی بیماری
جان گئی آرام نہ آیا
دل میں تمہارا درد تو اُٹھا
لب پہ تمہارا نام نہ آیا
جامِ عدم کب ہم تک لے کر
ساقیِ گُل اندام نہ آیا!



اُداس اُداس گلستاں سلام کہتے ہیں!
تمہیں بہار کے ارماں سلام کہتے ہیں

پھر آگیا ہے چمن میں بہار کا موسم
ہجوم سنبل و ریحاں سلام کہتے ہیں

تمہارے صبر و رِیا اور جواں تبسّم کو
ہزار چاکِ گریباں سلام کہتے ہیں

قبا کو کھول دو زلفوں کو منتشر کر دو!
کہ گل فروش شبستان سلام کہتے ہیں

چلو کہ شام بہاراں دعائیں دیتی ہے
اُٹھو کہ شہرِ فروزاں سلام کہتے ہیں

طلوع ہوتے ہی شب کو جو نوکِ شیشہ سے
وہ آفتاب درخشاں سلام کہتے ہیں

مغنیوں کی دھنیں انتظار کرتی ہیں
مصوروں کے دل و جاں سلام کہتے ہیں

عدم کے ساتھ جنھیں تم ملے تھے گلیوں میں
وہ واقعاتِ غزل خواں سلام کہتے ہیں



ہجوم یاس سے جب ہم اُداس ہوتے ہیں
خیال ہے وہ کہیں آس پاس ہوتے ہیں

لباسِ رنگِ نظر سے اتار دے اے دِل!
یہ شعبدے تو گلوں کا لباس ہوتے ہیں

مرے ندیم وہ لمحات کتنے دل کش ہیں
ترے خیال میں جب ہم اداس ہوتے ہیں

تمہاری ہنستی ہوئی آنکھ کے روّیے پر
کئی طرح کے گمان و قیاس ہوتے ہیں

خبر نہیں یہ روایت ہے یا حقیقت ہے
سُنا تو ہے وہ رگِ جاں کے پاس ہوتے ہیں

نہ گرد جھاڑ عدمؔ میرے جیب و داماں کی
مسافروں کو بگولے ہی راس ہوتے ہیں!



غرقِ ظلمات ہوتی جاتی ہے
زندگی رات ہوتی جاتی ہے

عقل جتنا سنبھل کے چلتی ہے
عقل کو مات ہوتی جاتی ہے

زندگی کے نظام میں حائل!
آپ کی ذات ہوتی جاتی ہے

دور میں آ رہے ہیں پیمانے
چاندنی رات ہوتی جاتی ہے

اے عدمؔ گو ہزار ہا غم ہیں
بسر اوقات ہوتی جاتی ہے



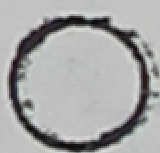
اے دلِ مضطرب اداس نہ ہو
زیست کو زہرِ غم ہی راس نہ ہو
کچھ نہیں زندگی کے دامن میں
کوئی مرہونِ التماس نہ ہو

نکہتِ گُل کو کس نے دیکھا ہے
آپ کے گیسوؤں کی باس نہ ہو
آج کچھ بات تم سے کرنی ہے
دیکھنا کوئی آس پاس نہ ہو

اے عدم خوش نہ ہو اگر کوئی
زندگی بھر کوئی اُداس نہ ہو



فرصت کے سہانے لمحوں میں کیا کام کی باتیں ہوتی ہیں!
کچھ یار کا قصہ ہوتا ہے کچھ جام کی باتیں ہوتی ہیں
اے دوست تبسم کی لہریں ہونٹوں پہ کہاں سے اب لاؤں
حالات کے میلے ہوتے ہیں، ایام کی باتیں ہوتی ہیں!
اربابِ خرد کی محفل میں دل اور پریشاں ہوتا ہے!!
کچھ سوچ کے وقفے ہوتے ہیں کچھ کام کی باتیں ہوتی ہیں
آلامِ زمانہ فرصت دیں تو بیٹھ کے دل کا حال کہیں!
اس زلفِ مسلسل کی باتیں، آرام کی باتیں ہوتی ہیں
جو شعر ہمارے سنتے ہیں مستی سے عدم سر دھنتے ہیں
ہم اہلِ طریقت کی باتیں الہام کی باتیں ہوتی ہیں!



پھولوں کا تبسم جھوم اُٹھا، لہروں کی روانی جھوم اُٹھی
احساسِ محبت کیا جاگا، نادان جوانی جھوم اُٹھی

افسانہ سرا نے بہتیرا مربوط کیا افسانے کو
انجام سے پہلے ہی لیکن، نادان کہانی جھوم اُٹھی

جب رات بھی دو لمحوں کے لئے ہم گھر میں فراغت سے بیٹھے
بے ساختہ گھر کی رونق پر من کی ویرانی جھوم اُٹھی

خوشبو کی یہ مستانہ لہریں کس باغ سے اُڑ کر آتی ہیں
یا یار کی زلفیں بکھری ہیں۔ یا رات کی رانی جھوم اُٹھی

پھولوں نے جگر کے چاک عدم سو بار دکھائے گو اُن کو
نادان کلی نے پھولوں کی اک بات نہ مانی جھوم اُٹھی



یہ اسرار رندوں کے تولے ہوئے ہیں
ترے نین بھی آج ڈولے ہوئے ہیں

نہ جانا چمن میں کہ اہلِ چمن نے
مہکتے ہوئے دام کھولے ہوئے ہیں

عدمؔ غرقِ مستی ہے اور زندگی نے
مصائب کے دیوان کھولے ہوئے ہیں



تری زلف زنجیر سی بن گئی ہے
یہ اُلجھن بھی تقدیر سی بن گئی ہے

مری خامشی ضبط کی کوششوں میں
کئی بار تقریر سی بن گئی ہے

ترا ذکر جب بھی کہیں آ گیا!!
مری شکل تصویر سی بن گئی ہے

عدمؔ سانس لینے کی ہمت نہیں تھی
مگر ایک تدبیر سی بن گئی ہے!



خرد بھی اسیرِ نظر ہو گئی — تری آنکھ بھی کارگر ہو گئی

روا تھا خدا کو بھی سجدہ مگر — جبیں آپ کا سنگِ در ہو گئی

شبِ غم کو کٹنا تو ممکن نہ تھا — مگر ہوتے ہوتے سحر ہو گئی

کوئی اور دل ڈھونڈ لیجئے گا حضور — وہ بستی تو زیر و زبر ہو گئی

جہاں کہنے والے کو لغزش ہوئی — وہیں داستاں مختصر ہو گئی

عدم زندگی کی حکایت نہ پوچھ

نہ معلوم کیسے بسر ہو گئی



پھولوں کی آرزو میں بڑے زخم کھائے ہیں
لیکن چمن کے خار بھی اب تک پرائے ہیں

اُن پر حرام ہیں غمِ دوراں کی تلخیاں
جن کے نصیب میں تری زلفوں کے سائے ہیں

روشن کئے ہیں دل میں تمناؤں کے چراغ
ویران بستیوں میں مسافر بسائے ہیں!

محشر میں لے گئی تھی طبیعت کی سادگی!
لیکن بڑے خلوص سے ہم لوٹ آئے ہیں

آیا ہوں یاد بعدِ فنا اُن کو اے عدمؔ
کیا جلد میرے صدق پہ ایمان لائے ہیں



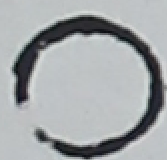
یوں سازِ نوبہار کی آواز آ گئی!
ٹوٹے ہوئے پروں کو بھی پرواز آ گئی
کھولی تھی ہم نے آنکھ کہ عیّارِ زندگی
لے کر بہار و میکدہ و ساز آ گئی
اِک سمت میں تھا ایک طرف دو جہاں کے غم
پر درمیان میں وہ نگہِ ناز آ گئی
بیٹھے تھے ساکنانِ قفس یونہی نا اُمید
اُڑنے لگے تو طاقتِ پرواز آ گئی!
مَیں کھو چلا تھا دشتِ تجسّس میں اے عدم
لیکن کوئی سُنی ہوئی آواز آ گئی!!



کس کی مدہوشی شریکِ ساز ہے
جو صدا ہے آپ کی آواز ہے!
آپ اک انگڑائی لے کر دیکھ لیں!
موسمِ گل مائلِ پرواز ہے!
دوستی میں غم بھی ہوتے ہیں بہت
غور کر لیجئے ابھی آغاز ہے
غنچہ و گل کی خموشی میں عدمؔ
کس حسینِ بیمار کی آواز ہے



اے دلِ ناشاد کیوں دلگیر ہے
زندگی اِک خوش نما زنجیر ہے!
میری حالت کا نہ غم فرمایئے
آپ کی کھینچی ہوئی تصویر ہے
اُس کی آنکھوں کا سہارا کون لے
میکشی رسوائی کی تدبیر ہے
اے علاجِ چشمِ غزالاں کا سکوت
اک شراب آلود سی تقریر ہے



تکلیف میں جو لب پہ ترا نام آ گیا
کچھ درد بڑھ گیا ذرا آرام آ گیا

میں جا رہا تھا تیرے تصور کے ساتھ ساتھ
رستے میں یونہی عالمِ اجسام آ گیا

ہم کو تو مے کے باب میں صرف اتنا علم ہے
جب بھی مطالبہ کیا اِک جام آ گیا

تھی وقتِ میکشی بھی وُہ بیداریٔ حواس
ساغر کے ساتھ سایۂ آلام آ گیا!

پوچھا تھا ایک صاحبِ دل نے مرا مزاج
بے ساختہ لبوں پہ ترا نام آ گیا

ہم نے تمہارے بعد نہ رکھی کسی سے آس
اِک تجربہ بہت تھا بڑے کام آ گیا

اے کاش کوئی جھوٹ ہی آ کر کہے مجھے
اُٹھ بھی عدمؔ کہ ساقیٔ گلفام آ گیا



شامِ فراق کم نہیں روزِ شمار سے
کرتے ہیں ذکرِ حشر کا کس اعتبار سے

بادہ کشی حرام ہے یا زندگی حرام
تصدیق کر رہا ہوں غمِ روزگار سے

ساقی شراب حسبِ ضرورت منگا کے رکھ
عمرِ خزاں طویل ہے عمرِ بہار سے

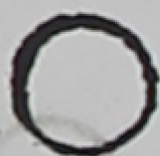
اِک جامِ زہر ہی کوئی دیتا خلوص سے
اِتنا بھی ہو سکا نہ کسی غمگسار سے

خوشبو ترے بدن کی ہے اس میں بسی ہوئی
ساقی لپٹ نہ جاؤں شبِ انتظار سے

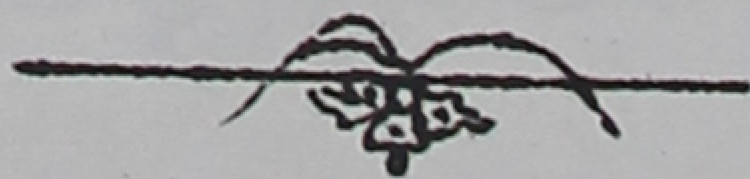
مفہوم گفتگو کا ملے بھی تو کیا عدمؔ
کرتے ہیں گفتگو وہ بڑے اختصار سے



یہ کیسی رات خالی جا رہی ہے!
بھری برسات خالی جا رہی ہے
ہماری بات ہوتی تو الگ تھا
تمہاری بات خالی جا رہی ہے
کبھی قحطِ وفا بھی قیمتی تھی!
اور اب بہتات خالی جا رہی ہے
مری مفلس جوانی لٹ لٹا کر
ترے دیہات خالی جا رہی ہے
عدمؔ برکھا کا کتنا شور و غل تھا!
مگر برسات خالی جا رہی ہے



ہَوا میں بوئے مستانہ نہیں ہے
کہیں نزدیک میخانہ نہیں ہے
زمانے کو پَرکھ کر بات کرنا
ہر اِک انسان دیوانہ نہیں ہے
ادھر سے او لڑکھڑا کر چلنے والے
یہ بستی ہے میخانہ نہیں ہے
اِدھر آ چوم لوں تیرے لبوں کو
یہ سُرخی بھی تو افسانہ نہیں ہے
عدمؔ آباد ہیں دل میں بیاباں!
خُدا کا شکر ویرانہ نہیں ہے



کہنے والے مری سرکار بجا کہتے ہیں
آپ کے حسن کو قدرت کی خطا کہتے ہیں

آپ سے مل کے طبیعت کو وہ ملتا ہے سکوں
جس کو اربابِ خرد آبِ بقا کہتے ہیں

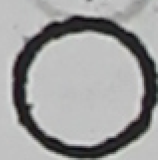
ہم کو فرصت نہیں موسیٰ کو سُن آئے
کیوں بلاتے ہیں وہ کیا کام ہے کیا کہتے ہیں

ٹھوکریں راہِ حوادث کی بُری چیز نہیں
بعض اوقات انہیں راہ نما کہتے ہیں

ہم نشیں صورتِ حالات سے مایوس نہ ہو
التجا دیر سے سنتا ہے خدا کہتے ہیں

دل کی تکلیف کا کیا کوئی مداوا ہو گا
زیست کو تیرے تغافل کی ادا کہتے ہیں

قابلِ رحم بنا دے جو ارادوں کو عدم
اس پریشان خیالی کو دعا کہتے ہیں



کوئی امید ہی بر آئی نہ ارماں نکلا / زندگی بھی کسی کنجوس کا داماں نکلا!

کعبہ و دیر کی تعمیر کے جب پیچ کھلے / اک ترا ایک مرا تارِ گریباں نکلا

یوں ملاقات ہوئی نزع کی ساعت ان سے / جسطرح رات گئے ماہ درخشاں نکلا

حشر کے باب میں کچھ حسنِ گماں تھا ہم کو / وہ بھی اس شوخ کا بھولا ہوا پیماں نکلا

تیری تحقیق کے الزام سے بچنے کیلئے / میری تصویر کا ہر رنگ پریشاں نکلا

ڈوبنا ہو تو بڑے عذر نکل آتے ہیں / جب کنارے سے بھی ٹکرائے وہ طوفاں نکلا

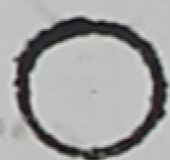
اسطرف کوئی توجہ ہی نہ کی تھی ہم نے / گھر کو جب غور سے دیکھا تو بیاباں نکلا

عقلِ جانکاہ تو خیر ایک مصیبت تھی عدمؔ
عشق بھی سلسلۂ زلفِ پریشاں نکلا





بڑے جوش پر موسم رنگ و بُو ہے
مگر گلستاں میں نہ مَیں ہوں نہ تُو ہے
زمانے کی مصروفیت تھم گئی ہے
وہ بیٹھے ہیں اور آئینہ روبرو ہے
فسانہ نہ چھِڑ جائے ناگاہ کوئی!
تری آنکھ آمادۂ گفتگو ہے!
ہمیں بھی چبھو دیجئے کوئی کانٹا!
ہمیں بھی کسی پھُول کی جستجو ہے!
عدمؔ زندگی کے ستم آپ کم ہیں!
تجھے اور کس چیز کی آرزو ہے!



تمہیں اہلِ دیر و حرم جانتے ہیں
مگر ہم کبھی کچھ بیش و کم جانتے ہیں

یہ کیا دل لگی ہے کہ اُس مہ جبیں کو
نہ ہم جانتے ہیں نہ ہم جانتے ہیں

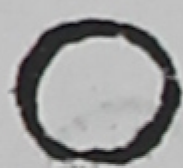
ہمارا پتہ اُن سے مت پوچھیے گا
کہ وہ ہم غریبوں کو کم جانتے ہیں

ترے راستے کا سفر کرنے والے
تری راہ کے پیچ و خم جانتے ہیں

چلو اُن فقیروں سے جا کر ملیں جو
نمودِ وجود عدم جانتے ہیں



بھولی بسری باتوں سے کیا تشکیلِ روداد کریں
ہم کو تو کچھ یاد نہیں ہے آپ ہی کچھ ارشاد کریں
کیسی محبت کیسی چاہت ہم پر سب کچھ روشن تھا
یونہی ذرا یہ شوق ہُوا تھا آؤ دِل برباد کریں
عشق نے سونپا ہے کام اپنا اب تو نبھانا ہی ہوگا
میں بھی کچھ کوشش کرتا ہوں آپ بھی کچھ امداد کریں
جیب و گریباں سوئے سوئے باغ و گلستاں سونے سے
بیٹھا ہے بیکار جنوں! سرکار کوئی ارشاد کریں
چھوڑ بھی اے دل جانے بھی دے ہم کو جب وہ بھول گئے
ہم کیوں ٹھنڈی آہیں بھر کر اُن کو ہر دم یاد کریں
حُسن کی دولت رکھنے والے کتنے بے پروا ہیں عدمؔ
ناز سے فرماتے ہیں ہنس کر کِس کِس کو برباد کریں



کو جب وہ موسم گُل میں زلفوں کو لہراتے ہیں
بادِ بہاری جھوم اُٹھتی ہے چاند ستارے گاتے ہیں
جب کوئی نیکی جاگ رہی ہو رحمت جھوم کے اُٹھتی ہے
جب کوئی توبہ ٹوٹ رہی ہو مے خانے تھرّاتے ہیں!
تم پھولوں کی نکہت پی کر نبض کو جاری رکھتے ہو
ہم کانٹے کی نوک چبھو کر دل کو نغمیں لاتے ہیں
اے مخمور نگاہوں والے تیرا کوئی دوش نہیں
لوگ بڑے ہشیار رہیں اکثر دیوانے ہو جاتے ہیں
دو چیزیں افراط سے ہم کو بخشی ہیں فطرت نے عدمؔ
ہوش سنبھالا ہے جب سے مے پیتے ہیں غم کھاتے ہیں



نہیں لطف ساقی کسی بات میں
مجھے غرق کردے خرابات میں

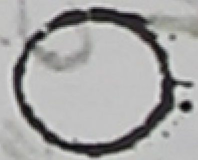
ہر اک بات کا فیصلہ ہو گیا!
محبت کی پہلی ملاقات میں

ابھی تک خرابات گردش میں ہے!
وہ دھومیں مچائیں ہیں برسات میں

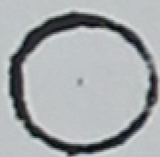
جوانی تھی یا مے پرستی کا دور
بڑے میکدے تھے خیالات میں

عدم اتفاق اور اتنا حسین
ملاقات اور چاندنی رات میں





فضا لہلہائی گھٹا چھا گئی
تری آنکھ اٹھی اور بہار آ گئی
کہا تھا محبت نے کیا زیرِ لب
جنوں ہنس پڑا ہوش شرما گئی!
بڑی دلکشی تھی ہر ایک چیز میں
نہ معلوم کس کی نظر کھا گئی
ہوئی یوں پریشاں وہ زلفِ دراز
کہ حدِ نظر تک گھٹا چھا گئی
عدم جام وہ چھلکتی ہوئی بھی نظر
مرے ظرفِ ہستی کو چھلکا گئی!

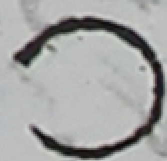


بے وفا چاند ستاروں نے نہ پوچھا ہم کو
اپنے خود سر تھے نگاروں نے نہ پوچھا ہم کو
وقتِ تکلیف کا لے دوست جب آیا درپیش
غیر تو غیر ہیں یاروں نے نہ پوچھا ہم کو
جانے کیا بات تھی تکتے رہے خاموشی سے
ڈوبتے وقت کناروں نے نہ پوچھا ہم کو
آشنا تھے بہت اچھی طرح ہم سے لیکن
جان کر بادہ گساروں نے نہ پوچھا ہم کو
راہ روکیوں کوئی دلجوئی کی زحمت کرتا
سنگدل راہگزاروں نے نہ پوچھا ہم کو
دلِ غمگین کا سہارا تھے کئی بار غلام
دلِ غمگیں کے سہاروں نے نہ پوچھا ہم کو





رنگ کا اکتساب لے آؤ — چاندنی کا شباب لے آؤ
موت کی خامشی مسلط ہے — زندگی کا رباب لے آؤ
غنچہ و گل کی نبض ڈوبی ہے — شبنم و آفتاب لے آؤ
بحرِ ظلمات سے گزرنا ہے — کشتیٔ ماہتاب لے آؤ
جا کے پیرانِ میکدہ سے عدمؔ — نو کشیدہ شراب لے آؤ



عذر کیا خوشگوار ہوتے ہیں — جُرم بے اختیار ہوتے ہیں
ہم کو یوں بھی تباہ ہونا تھا — آپ کیوں شرمسار ہوتے ہیں
ہم غریبوں کے جرمِ ہستی پر — تبصرے بار بار ہوتے ہیں
ان سے ملنا اگر مقدّر ہو — راستے بے شمار ہوتے ہیں

جب بھی ہوتے ہیں عدمؔ تنہا!
یار سے ہمکنار ہوتے ہیں!



میرے محبوب تری زلف پریشاں کیوں ہے
اتنا بے رحم مزاجِ غمِ دوراں کیوں ہے

ساقیا! آ ترے دامن کا بھی درماں کر دوں
موسمِ گُل کو گِلا ہے کہ گریباں کیوں ہے

میرے غمخانے کی مشعل کو بجھانے والے
تیرے ایوان کی قندیل فروزاں کیوں ہے

دِل تو ہونا تھا ٹوٹ ہی جانا تھا یہ حال اسے
توڑنے والے اِتری آنکھ پریشاں کیوں ہے

تم تو طوفان کو تفریح سمجھتے تھے علامؔ
آج ساحل ہی پہ اندیشۂ طوفاں کیوں ہے



گُل کھلیں، بادِ نو بہار چلے — لے کے انگڑائی جوئبار چلے

ناچتی انکھڑیوں کی تانوں پر — نکہتِ زلفِ مشکبار چلے

یوں چلیں لڑکھڑا کے زہرہ جبیں — جس طرح ابرِ کوہسار چلے

یوں کھلیں مسکراہٹوں کے کنول — جیسے چاندی کی جوئبار چلے

ایسے رقصاں ہو بوئے عنبر و عود — جیسے دوشیزۂ بہار چلے

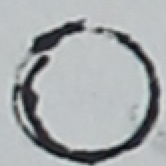
یوں خرامِ آفریں ہو رنگ کی لہر — جس طرح کوئی میگسار چلے

عطر آلود گیسوؤں کی ہوا — صورتِ موجِ آبشار چلے

یوں ہم آغوشیوں کے دریا میں — کشتیٔ یار و شہریار چلے

ہو فضا میں بلند یہ فریاد — چھوڑ دو پیرہن کے تار چلے

فصلِ گُل میں تو اے عدم کوئی
عنبریں جوت ہمکنار چلے!



یہ بات سہل نہیں پر یہ بات ہوتی ہے
کبھی کبھی نظرِ التفات ہوتی ہے
سکونِ قلب و نظر سے ہماری کیا نسبت
کہ وہ تو تری مروّت کی بات ہوتی ہے
بغیر گردشِ جام و بغیر نکہتِ زُلف!
نہ صبح ہوتی ہے ساقی نہ رات ہوتی ہے
خدا کرے کبھی مفہوم زندگی بخشے!
وہ اک نگاہ کہ شرحِ حیات ہوتی ہے
وہ اِک خطائے جنوں دار ہے صِلا جس کا
وہی تو تربیت کائنات ہوتی ہے
وہاں سے راہنما کا پتہ نہیں چلتا!
جہاں عدم کے مسافر کو رات ہوتی ہے



غمِ زمانہ کو غرقِ شراب کردوں گا
شبِ سیہ کو شب ماہتاب کردوں گا

گماں نہ کر کہ مجھے جراتِ سوال نہیں
فقط یہ ڈر ہے تجھے لاجواب کردوں گا

میں بدنصیب ہوں مجھ کو نہ دو خوشی اتنی
کہ میں خوشی کو بھی لے کر خراب کردوں گا

مرے لئے تو خرابات ٹھیک ہے اے ہوش
تجھے بھی کوئی جگہ انتخاب کردوں گا

دماغِ بادہ کشی تو نہیں عدم لیکن
کچھ احترام شبِ ماہتاب کردوں گا



گرم راتوں کو خوشگوار کریں / عنبریں گیسوؤں سے پیار کریں

لوگ دنیا سے بدگماں کیوں ہیں / آؤ دنیا کا اعتبار کریں!

ایک انگڑائی؟ وہ بھی ٹھنڈی سی / آپ اندازۂ بہار کریں!

عقل اب معترض نہیں ہوگی / آؤ! نادانیوں سے پیار کریں

آج دل میں عدم بڑا غم ہے / آج تالیفِ زلفِ یار کریں

زیست کا مدعا نہیں پایا / جانکنی کا صلا نہیں پایا

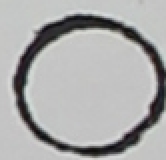
چھوڑ اب کیا محل ہے پرسش کا / تیری رحمت سے کیا نہیں پایا

لطف کی کیا حکایتیں چھیڑیں / ظلم کو بھی روا نہیں پایا

درد کا کچھ علاج ہو ہی گیا / درد کو لا دوا نہیں پایا

خوئے تسلیم پر تو جان دے دی / پر مزاجِ رضا نہیں پایا

گمرہی تھی عدم جو کام آئی / اور کوئی رہنما نہیں پایا



سفینۂ خواب پریشان بن گیا ہوگا
کسی جگہ کوئی طوفان بن گیا ہوگا

سُنا ہے گُم ہے ترے گیسوؤں کا پھول کوئی
ہری حیات کا عنوان بن گیا ہوگا

مزاجِ شیخ سُنا ہے پھر آج برہم ہے
مرا خیال بھی انسان بن گیا ہوگا

کیا تھا ایک تبسّم جو اُس نے گلشن میں
حیاتِ سنبل و ریحان بن گیا ہوگا

بکھر کے زلف چمن خیز ہو گئی ہوگی
نکھر کے حادثہ رومان بن گیا ہوگا

وہ غم علاجِ غم جسے کونین جذب کر نہ سکے
وہ غم مقدّرِ انسان بن گیا ہوگا

—



مری نظر تری تصویر ہو خدا نہ کرے
ترے شباب کی تشہیر ہو خدا نہ کرے

کیا ہے ضبط بڑے جبر سے تکلّم پر
مرے سکوت میں تقریر ہو خدا نہ کرے

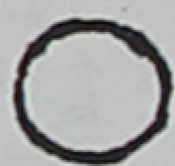
وہ اک علیل سی کوشش جو کر رہا ہوں میں
خلافِ شوئیٔ تقدیر ہو خدا نہ کرے

وہ جس نے اتنی حسیں الجھنیں عطا کی ہیں
وہ مہ جبیں کبھی دلگیر ہو خدا نہ کرے

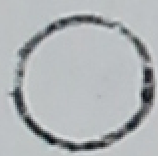
میں جام اُٹھاؤں مگر تجھ سے مشورہ نہ کروں
غمِ زمانہ! یہ تقصیر ہو خدا نہ کرے

خدا امان میں رکھے ترے نشیمن کو
مجھے بھی حسرتِ تعمیر ہو خدا نہ کرے

مرا نصیب عدمؔ اک شراب خانہ ہے
مجھے شکایتِ تقدیر ہو خدا نہ کرے



رباب وچنگ نہیں مطرب وشراب نہیں
کوئی بہانۂ تسکینِ اضطراب نہیں
غمِ حیات کا مفہوم پوچھنے والے
یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں
نہ زہر دو ابھی ہم بیکسوں کو چارہ گر
ہمارا حال ابھی اس قدر خراب نہیں
اب اس کے بعد بھی ہے حشر کی کوئی صورت
ہمیں حجاب ہے لیکن تمہیں حجاب نہیں
ہے وقتِ خفتنہ بہاروں کے جاگنے کا علم
وہ محوِ خواب ہیں لیکن وہ محوِ خواب نہیں



نہ کیجئے اتنے سوالات بھول جاؤں گا
جو بات اہم ہے وہی بات بھول جاؤں گا

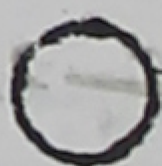
نشاں بنا کے نہ رستہ دکھائیے مجھ کو
میں راستے کے نشانات بھول جاؤں گا

شکایتیں ہیں بہت سی کہ وہ نہیں موجود
وہ آ گئے تو شکایات بھول جاؤں گا

بس اک حقیقت بے رحم کی ضرورت ہے
تمام رسم و روایات بھول جاؤں گا

حضور بات بڑی مختصر ہے سن لیجئے
مجھے یہ ڈر ہے کہ میں بات بھول جاؤں گا

جو بھولتی ہی نہیں اے عدم بھلائے سے
وہ چار دن کی ملاقات بھول جاؤں گا



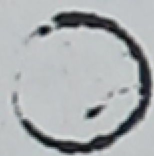
حسن کی سرگرانیاں افسوس
عشق کی ناتوانیاں افسوس

زندگی سے بھی مختصر نکلیں
آپ کی مہربانیاں افسوس

ایک چھوٹی سی آزمائش میں
کٹ گئیں زندگانیاں افسوس

دکھتی دکھتی محبتیں صد حیف
جلتی جلتی جوانیاں افسوس

کتنی ویران ہیں عدم آنکھیں
آنسوؤں کی روانیاں افسوس



جام موجود ہے شراب نہیں!
صورت حال کا جواب نہیں!
زہر دیجئے کسی سلیقے سے
مجھ کو پینے سے اجتناب نہیں
عشق جولانیٔ طبیعت ہے
عشق نادانیٔ شباب نہیں
زندگی حادثہ سہی لیکن!
حادثہ میرا انتخاب نہیں
آپ بھی خوب ہیں علامہ صاحب
آپ کا بھی کوئی جواب نہیں



ہر چند بدظنی سی ہے کچھ تیرے نام سے
لیتا ہوں تیرا نام بڑے احترام سے
ساقی ترے خلوص نے گرویدہ کر لیا
آیا تھا ورنہ میں بھی ادھر ایک کام سے
گذرے گی زندگی کی سیہ رات کس طرح!
دل کا چراغ گُل ہوا جاتا ہے شام سے
فرصت نہ مل سکی ہمیں آلامِ زیست سے
ورنہ بُلا رہا تھا کوئی ہر مقام سے
جو لمحہ میکدے کی ہوا میں کٹے علمؔ!
وہ لمحہ قیمتی ہے حیاتِ دوام ہے



بادل گھرے ہیں گیسوئے پیچاں بکھیر دو
نیندیں برس رہی ہیں شبستاں بکھیر دو

تاخیر کیا ہے آمدِ فصلِ بہار میں
سرکار مسکرا کے گلستاں بکھیر دو

افسانہ بن گئی ہے حدیثِ کلیم و طور
اب سوئے طور مجمعۂ رنداں بکھیر دو

اے میکشو! بہار کی تعظیم چاہیئے
کچھ بھی نہ ہو تو جیب و گریباں بکھیر دو

حالت عدم کی آج نہایت خراب ہے
اک لمحہ اپنی زلف پریشاں بکھیر دو



کٹ گئی غم کی رات یاد نہیں
اب ہمیں کوئی بات یاد نہیں
زیست کی مہربانیاں توبہ
آپ کا التفات یاد نہیں
کل کی باتیں تو خیر خواب ہوئیں
آج کے واقعات یاد نہیں
آپ کیوں شرمسار کرتے ہیں
واقعہ ہے کہ بات یاد نہیں
جام گردش میں آرہا ہے علیم
زیست کے حادثات یاد نہیں



نہ آس ہے نہ کوئی انتظار بیٹھے ہیں
نکلے ہوئے ہیں سرِ رہ گذار بیٹھے ہیں

گلا نہ کر کہ تجسس نہیں کیا تیرا
اُڑا کے دیر و حرم کا غبار بیٹھے ہیں

یہ وقتِ شام، یہ جنگل، یہ کنجِ تنہائی
بڑا سکوں ہے بڑے برقرار بیٹھے ہیں

بہارِ آئینہ دل سے اب نہ جائے گی
کچھ اس طرح ترے نقش و نگار بیٹھے ہیں

سنو فسانۂ عہدِ بہار کانٹوں سے
یہ باخبر یہاں عمریں گذار بیٹھے ہیں

میں بزمِ حشر کو لے کر عدم نہ اُڑ جاؤں
کہ میرے سامنے وہ شرمسار بیٹھے ہیں



غم کے ماروں کو کون پوچھے گا!
بے سہاروں کو کون پوچھے گا
ہوشمندوں کو پوچھنے والو
بادہ خواروں کو کون پوچھے گا!
جام و مینا طلوع ہوتے ہیں
چاند تاروں کو کون پوچھے گا
اُٹھ گئے جب فقیر رستے سے
راہگذاروں کو کون پوچھے گا
اے عدم ان سے خود ملو جا کر
انتظاروں کو کون پوچھے گا



عجیب کیا ہے کوئی بات ہو گئی ہو گی
مسافروں کو کہیں رات ہو گئی ہو گی

گیا تھا دل مگر اب تک نہیں ہوا واپس
کسی حسیں سے ملاقات ہو گئی ہو گی

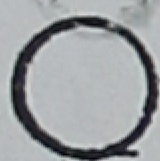
ہجوم حشر میں جب وہ ہمیں ملے ہوں گے
عجیب صورتِ حالات ہو گئی ہو گی

بکھر رہی تھی وہ زلفِ دراز تھم تھم کر
بکھر کے چشمۂ ظلمات ہو گئی ہو گی

شبِ الم کے تعاقب میں کون جائے عدمؔ
کہیں رہینِ خرابات ہو گئی ہو گی!



کسی مہ جبیں سے تعارف کرا دو
کسی میکدے سے صبوحی پلا دو
اگر روتے روتے بہت تھک گئے ہو
تو اے رونے والو ذرا مسکرا دو
کہاں جائے گی عشرتِ عمرِ رفتہ
ذرا لڑکھڑاتی ہوئی اِک صدا دو
خدا بھی علاجِ حادثہ بن گیا ہے
اُسے بھی بڑی عاجزی سے بھُلا دو



صراحی میں گل رنگ پانی نہیں ہے
تلاطم نہیں ہے روانی نہیں ہے
نصیحت بڑی قیمتی شئے ہے ناصح!
مگر یہ علاجِ جوانی نہیں ہے
دلِ مضطرب عہدِ گل میں نہ مرنا
ہمیں فرصتِ نوحہ خوانی نہیں ہے
زمانے کی رعنائیوں پر نہ جانا
کوئی چیز اتنی پُرانی نہیں ہے
ستارے ہیں اُترے ہوئے میکدے میں
عدم واقعہ ہے کہانی نہیں ہے



روح انساں کی جب رقص میں آجاتی ہے
عرش تک سازِ محبت کی صدا جاتی ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ تماشا کیا ہے!
جو حسیں شکل ہے آنکھوں میں سما جاتی ہے

بعض اوقات ڈبونے کے ارادے سے ہُوا
ڈوبنے والوں کو ساحل پہ لگا جاتی ہے!
اس سے آگے کوئی مشعل نہیں دیکھی ہم نے
میکدے تک تو ستاروں کی ضیا جاتی ہے

پوچھ مت رات کے اس عالمِ خاموش کا حال
سوچتے سوچتے جب نیند سی آجاتی ہے!
پھول جب کرتے ہیں شبنم کی ضرورت محسوس
رات جاتے ہوئے کچھ اشک بہا جاتی ہے

کثرتِ لطف بھی اک ظلم کی صورت ہے عدمؔ
تیز خوشبو کی مہک آگ لگا جاتی ہے



دلنوازی کی کوئی بات ہوئے دیر ہوئی
دن ہوئے دیر ہوئی رات ہوئے دیر ہوئی

عقل کو راہ پہ آئے ہوئے عرصہ گذرا
ہوش کو غرقِ خرابات ہوئے دیر ہوئی

لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
لوگ کہتے ہیں کہ برسات ہوئے دیر ہوئی

ہنس ہی لیتے تھے کبھی جبر سے ہم بھی لیکن!
بندہ پرور یہ کرامات ہوئے دیر ہوئی

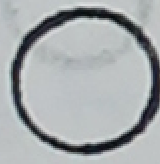
آج اے گردشِ ایّام کوئی کام تو کر!
اس پری رو سے ملاقات ہوئے دیر ہوئی

میکدے پر کوئی بجلی نہ گرے اے ساقی!
شور برپا ہے کہ خیرات ہوئے دیر ہوئی

تو سمجھتا ہے کہ میں کھیل رہا ہوں تجھ سے
مجھ کو اے جانِ عدم مات ہوئے دیر ہوئی۔



چلے ہو غریبوں سے رنجور ہو کر
ابھی لوٹ آؤ گے مجبور ہو کر
سُنا ہے غرور اک حسیں خستگی ہے
پشیماں نہ ہوں آپ مغرور ہو کر
مجھے آزمائش میں مت ڈالیے گا
مَیں مر جاؤں گا آپ سے دُور ہو کر
اُن آنکھوں کی حالت کچھ ایسی ہے جیسے
اُٹھے میکدے سے کوئی چُور ہو کر!
ابھی تو کھِلا تھا عدمؔ غنچۂ دل
کہاں اُڑ گیا رنج کافور ہو کر!



شگفتہ شگفتہ سُہانے سُہانے
کہاں جا بسے وُہ مقدس زمانے

گرے جب بھی میخوار سجدے میں پی کر
ستاروں سے ٹکرا گئے بادہ خانے

چلو خیر اب ذکر کیا اُن ضدوں کا
نہ ہم لوگ مانے نہ تم لوگ مانے

نہ پوچھو یہ صوفی منش لوگ شبکو
کہاں جا رہے ہیں وضو کے بہانے

یہ کس رنگ کی گردشیں کھا رہا ہے
ارے او زمانے، ارے او زمانے

کہاں راستہ دیکھتے بجلیوں کا
بہار آئی اور جل گئے آشیانے

عدم فصلِ گل ہو کہ عہدِ جوانی
بڑا لطف دیتے ہیں رنگیں فسانے



جس سمت بھی وُہ فتنۂ رفتار جائے گا
آنچل کے ساتھ سایۂ گلزار جائے گا

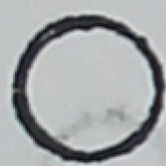
ہے اک ذرا سی ہوش تو مانگ آج دادِ حسن
کل تک جو بچ گیا یہاں۔ بیکار جائے گا!

اے دوست دردِ عشق ہو یا دردِ زندگی
دل میں جو بس چکا ہے وہ دشوار جائے گا

یہ ابرِ نو بہار۔ یہ فصلِ ہجومِ گل!
دامن چھڑا کے ہم سے کہاں یار جائے گا

اے کاش فصلِ گل میں نہ نکلے وُہ سیر کو
نکلا تو عاشقوں کو عدم مار جائے گا





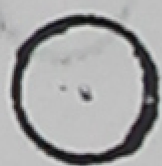
کام تقدیر کے کیا عقل سے آساں ہوں گے
جس قدر ہوش میں آئیں گے پریشاں ہوں گے

جن اندھیروں میں چراغوں سے اُجالا نہ ہُوا
وہ اندھیرے تری آنکھوں سے فروزاں ہوں گے

پُھول ہیں اور بھلا ان کا مقدّر کیا ہے
آج ثابت ہیں تو کل چاک گریباں ہوں گے

جن خیالوں سے فروزاں تھا شبستانِ حیات
کیا خبر تھی ترے بھولے ہوئے پیماں ہوں گے

زیست کو آگ لگانے کے لئے اب بھی عدمؔ
دل میں دو چار سُلگتے ہوئے ارماں ہوں گے



جینے کے لئے ارمانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے
پینے کے لئے پیمانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے
ایسا بھی کبھی ہو جاتا ہے آپ ایسے امیر انسانوں کو
ہم ایسے غریب انسانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے
جب شمع فروزاں ہوتی تھا، ماحول فسردہ رہتا ہے
رونق کے لئے پروانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے
ہر شخص حقائق کی تلخی سے اتنا پریشاں ہوتا ہے
ہر شخص کو کچھ افسانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے
جب موسم میں دن آتے ہیں ہر گھر میں غم سے دیوانے
اس موسم میں دربانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے!



مے نوشی کی ترغیبیں بھی ہوش کے جھوٹے حیلے ہیں!
جن نینوں میں امرت ہے وہ نین بڑے شرمیلے ہیں
اے گلچیں ان کلیوں کو کچھ نشو و نما تو پا نے دے
اِن کلیوں کے نازک نازک انگ بڑے لچکیلے ہیں
صرصرِ دوراں میخانے میں رنگ نہ تیرا اُڑ جائے
اُس گلشن میں کھلنے والے پھول بہت چمکیلے ہیں
دیکھنے والے ہوش میں رہنا سب دھوکا ہی دھوکا ہے
جسم بڑے بدصورت ہیں ملبوس بڑے بھڑکیلے ہیں
شیخ و برہمن دونوں کی محشر میں علامؔ یہ حالت ہے
اِن کے رنگ بھی پیلے ہیں اور اُن کے رنگ بھی پیلے ہیں



اسباب سازگار نہیں ہیں تو کیا ہوا
حالات خوشگوار نہیں ہیں تو کیا ہوا

تارے ہیں، آبجو ہے، ہوائیں ہیں پھول ہیں
ہم مجلسی کو یار نہیں ہیں تو کیا ہوا!

تم اپنی کاکلوں کو جھٹک کر تو دیکھ لو!
ہم قائلِ بہار نہیں ہیں تو کیا ہوا!

ہے زندگی بجائے خود اک دلفریبِ غم
مرہونِ زلفِ یار نہیں ہیں تو کیا ہوا

ہم فصلِ گُل پہ جان چھڑک دیں گے اے عدم
دامن میں چند تار نہیں ہیں تو کیا ہوا!



حیران نہیں ہوں سلسلۂ حادثات پر
میں غور کر رہا ہوں کسی اور بات پر
جب سے ہوا ہے اسکی نگاہوں کا کچھ کرم
جوبن سا آگیا ہے ذرا واقعات پر
جینا ہے چار روز تو اے صاحبِ خرد
گہری نظر نہ ڈال فریبِ حیات پر
ممکن ہے نامہ بر ترا کہنا درست ہو
مجھ کو تو اعتبار نہیں تری بات پر
غلطاں تھی کائنات اُسی رنگ میں علامؔ
جس رنگ سے نگاہ پڑی کائنات پر



عمر گھٹتی رہی خبر نہ ہوئی
وقت کی بات وقت پر نہ ہوئی

جب سے آوارگی کو ترک کیا
زندگی لطف سے بسر نہ ہوئی

بارہا شرمسار ہونا پڑا
وقت پر کوئی چیز گھر نہ ہوئی

اُس کی زلفوں سے مشورہ بھی کیا
داستاں پھر بھی مختصر نہ ہوئی

زندگی کا معاملہ مت پوچھ
کٹ گئی گو علامؔ بسر نہ ہوئی



فریبِ بیش و کم نے مار ڈالا
اُمیدوں کے بھرم نے مار ڈالا
زمانے کے سِتم تو سہہ ہی لیتے
رفیقوں کے کرم نے مار ڈالا
طبیعت کو بڑی رغبت تھی غم سے
غرض یہ ہے کہ غم نے مار ڈالا
خرد کا مشورہ تسلیم کر کے
دِلِ ناداں کو ہم نے مار ڈالا
بہت پختہ تھا عذرِ زیست لیکن
خیالاتِ عدم نے مار ڈالا



ساقیِ غم زمانہ کو دشنام چاہیئے
اور میں، مجھے تو صرف ترا نام چاہیئے

اِک عمر ہے اطاعتِ یزداں کے واسطے
دو چار دن پرستشِ اصنام چاہیئے

ساقی تو اپنی چشمِ درخشاں سے پوچھ لے
موسم کو اک چھلکتا ہُوا جام چاہیئے

یہ مانتا ہوں میں کہ شبِ نو بہار میں
زلفِ دراز و عارضِ گلفام چاہیئے

لیکن کسی کو گھر میں بلانے کے واسطے
رطلِ شراب و شکلِ در و بام چاہیئے

ساقی مجھے شراب کی تہمت نہیں پسند
مجھ کو تری نگاہ کا الزام چاہیئے

ساقی غمِ ضیاؔ کو بھی اذنِ رقص دے
اس نامراد کو بھی کوئی کام چاہیئے

کرنا ہے عذرِ توبہ خرابات میں علاج
اے بے ادب اطاعتِ احکام چاہیئے



دو دن کی زندگی کو بھی سامان چاہیئے
اُمید چاہیئے، کوئی ارمان چاہیئے

غلمان و حور سے نہیں مطلب کوئی مجھے
انسان ہوں مجھے کوئی انسان چاہیئے

میں روک دوں گا گردشِ دوراں کا راستہ
مجھ کو فقط حضور کا فرمان چاہیئے

دیکھیں کہاں سے ملتی ہے یہ مرگِ ناگہاں
افسانۂ حیات کا عنوان چاہیئے!

وعدہ تو اضطراب کو کرنا ہے اور تیز
بندہ نواز درد کا درمان چاہیئے

ساقی تری نگاہ کا مقصود کچھ بھی ہو
کچھ روز میرے دل میں بھی مہمان چاہیئے

اے شیخ کیوں عدم سے اُلجھتا ہے بے سبب
کم بخت ہر مزاج کی پہچان چاہیئے!

★



جنوں زندگی میں مخل ہو رہا ہے
تصور ترا مستقل ہو رہا ہے

کوئی بات پھر یاد آئی ہے دل کو
کوئی زخم پھر مندمل ہو رہا ہے

ابھی کیا شکایت کریں چارہ گر کی
ابھی چارۂ دردِ دل ہو رہا ہے

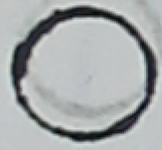
عدم عقل کی جستجو کا قصور
خرابات میں منتقل ہو رہا ہے



جبیں کی چمک گیسوؤں کا اندھیرا
کہیں شام تھی اور کہیں تھا سویرا
امیروں کے محلوں کو مہکانے والے
غریبوں کی بستی میں بھی کوئی پھیرا
چلے گا بھلا تیرے کہنے پہ کیسے
ارے ناخدا یہ سفینہ ہے میرا
یہاں میں بھی مہمان تو بھی مسافر
یہ بے فیض گلشن نہ تیرا نہ میرا
بڑی بے رُخی سے ملے وہ چمن میں
نہ آنکھیں ملائیں نہ گیسو بکھیرا
زمانے کے اطوار سے تنگ آ کر
علاؔم کر لیا میکدے میں بسیرا!



سننے والا حالِ دل احساس سے بیگانہ تھا!
اُس نے یہ سمجھا کہ میں نے جو کہا افسانہ تھا
آہ وہ عہدِ جوانی کے مقدس مشغلے!!
میکدہ تھا یہ طوافِ کوچۂ جانانہ تھا
عارضوں میں بت کدہ تھا۔ گیسوؤں میں کہکشاں
انکھڑیوں میں چاندنی تھی۔ ہاتھ میں پیمانہ تھا
شمع کے نزدیک کوئی شے تو تھی کل رات کو
یا کوئی بجلی تھی رقصاں۔ یا کوئی پیمانہ تھا
اللہ اللہ صورتوں کی بدگمانی کا شباب
آئینے کو غور سے دیکھا تو حیرت خانہ تھا
عقل کے بارے میں اتنا جانتے ہیں ہم علامہ
جس میں تھوڑی سی فراست تھی وہی دیوانہ تھا



گلے لگ لگ کے جب اک دوسرے سے یار ملتے ہیں
نہ پوچھ اسوقت ہم کتنے جگر افگار ملتے ہیں

مسافر جادۂ ہستی کے کتنے پا شکستہ ہیں
کہ جب ملتے ہیں زیرِ سایۂ دیوار ملتے ہیں

طبیعت مطمئن رکھیئے ۔ بڑی زرخیز ہے دُنیا
یہاں اندوہ و غم ۔ انبار در انبار ملتے ہیں

اگرچہ قحط ہے جنسِ محبّت کا زمانے میں
مگر اس قحط میں بھی اہلِ دل سرکار ملتے ہیں

خردمندوں سے میں اس واسطے پرہیز کرتا ہوں
کہ اِن میں اختلالِ ہوش کے آثار ملتے ہیں

عدم اسباب کچھ ہیں تو سہی دِل کی تسلّی کے
مگر اسباب وہ ہیں جو بہت دشوار ملتے ہیں!



اگر آغازِ آزادِ غم انجام ہو جائے
فسانہ زندگی کا گیسوئے اصنام ہو جائے

مرے محبوب یہ دنیا بڑی دِل چسپ دُنیا ہے
یہاں آکر خدا بھی موردِ الزام ہو جائے

مری مستی سے تیری انکھڑیوں کی بات قائم ہے
اگر مَیں ہوش میں آجاؤں تو بدنام ہو جائے

اتری چشمِ غزالیں میں اگر اک مرتبہ ڈوبے
شریعت رنگ بن جائے مشیّت جام ہو جائے

کوئی جام اس طرح چھلکے کہ موسم لہلہا اُٹھے
کوئی زلف اس طرح بکھرے کہ گہری شام ہو جائے

عدؔم جب ہوش میں ہوتا ہوں یوں محسوس کرتا ہوں
وہ رہرو ہوں۔ جسے جنگل میں گہری شام ہو جائے



جو پھول بن نہیں سکتے وہ خار ہوتے ہیں
جفائے یار کے سانحے ہزار ہوتے ہیں
تعلقات کے رشتے کو توڑنے والے
تعلقات بڑے استوار ہوتے ہیں
حضور آپ کو بھی اس کا تجربہ ہے کوئی
سُنا ہے لوگ تغافل شعار ہوتے ہیں
اسیرِ زلفِ مسلسل نہ کر ہمیں اے دوست
کہ زندگی میں بڑے کاروبار ہوتے ہیں
عدم خلوص سے مِل میکدہ نشینوں سے
یہ وہ فقیر ہیں جو شہریار ہوتے ہیں



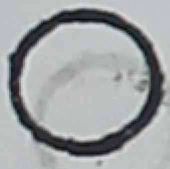
اگرچہ روزِ ازل بھی یہی اندھیرا تھا
تری جبیں سے نکلتا ہُوا سویرا تھا

پہنچ سکا نہ میں بر وقت اپنی منزل پر
کہ راستے میں مجھے رہبروں نے گھیرا تھا

تری نگاہ نے تھوڑی سی روشنی کر دی
وگرنہ عرصۂ کونین میں اندھیرا تھا

یہ کائنات اور اتنی شراب آلودہ
کسی نے اپنا خمارِ نظر بکھیرا تھا

ستارے کرتے ہیں اب اس گلی کے گردِ طواف
جہاں علاؔم مرے محبوب کا بسیرا تھا



تری نگاہ کو بیمار کس نے دیکھا ہے
خرامِ مستیٔ بیدار کس نے دیکھا ہے

وجودِ سایۂ دیوار ہے تڑپ میری
وجودِ سایہ دیوار کس نے دیکھا ہے

بیمار سے ہوتے ہوئے آپ کو لگاوٹ ہے
ہمیں بنائیے سرکار کس نے دیکھا ہے

جہاں دلوں سے زیادہ عزیز ہو دولت
وہاں خلوصِ خریدار کس نے دیکھا ہے

روا ہے تہمتِ مستی مگر علام ہم کو
پیئے ہوئے سرِ بازار کس نے دیکھا ہے



ہر رنج کو خفیف تبسم سے ٹال دے
نازل ہو کوئی برق تو ساغر اُچھال دے
اس کی جفا کو جورِ ازل تک تو کر طویل
میری وفا کی کوئی مکمل مثال دے
صہبا کو آج جام میں مت ڈال ہم نشیں!
اس کو براہ راست میرے دِل میں ڈھال دے
کتنی گریز پا ہیں مسرت کی ساعتیں
اے دوست اِن کے پاؤں میں زنجیر ڈال دے
ساقی تجھے سعادتِ دارین ہو نصیب
روحِ علامؔ سے غفلت کا کانٹا نکال دے



کیوں رنگ اڑ رہا ہے دلِ بے قرار کا
شاید یہ رہنے والا نہیں اس دیار کا

کھلنے لگا تھا پھول کہ مرجھا کے گر گیا
کیا تنگ حوصلہ تھا ہوائے بہار کا

لو جا رہا ہوں قیدِ عناصر کو توڑ کر
پہلا ثبوت ہے یہ مرے اختیار کا

پیتا ہوں حادثات کے عرفان کے لیے
مے ایک تجزیہ ہے غمِ روزگار کا

ساقی حدیثِ کوثر و تسنیم سب غلط
ساغر چھلک گیا تھا کسی میگسار کا

دھوکا دیا ہے تم نے علامؔ کے خلوص کا
یہ راستہ نہیں ہے تمہارے دیار کا



عالم تمام عالم نقش و نگار تھا
جب تک نظر میں رنگ تھا عہدِ بہار تھا

دی جس نے اہلِ ہوش کو ترغیبِ میکشی
میرا خیال ہے کہ غمِ روزگار تھا!

دشنام دیجئے نہ غمِ روزگار کو
گو خود ذرا بُری تھی مگر میرا یار تھا

ہم نے پناہ لی تیری زلفوں کی چھاؤں میں
ماحولِ زندگی کا بہت شعلہ بار تھا

یارب میرے ہی فردِ عمل کا نہیں یہ رنگ
اس گیسوئے سیاہ سے دنیا کو پیار تھا

مت پوچھ اے عدمؔ کہ کٹی کس طرح حیات
حالات کا سلوک بڑا خوشگوار تھا!



کیوں تری آنکھ میں سُرخی سی اُتر آئی ہے
مَیں نے کِس وقت ترے سر کی قسم کھائی ہے
کیا خبر تھی کہ محبت سی مقدس شئے بھی
میری بدنامی ہے اور آپ کی رسوائی ہے
دل کی بستی میں اندھیرا سا ہُوا جاتا تھا
شکر ہے آپ کی صورت تو نظر آئی ہے
ہوشمندوں کی پریشان خیالی پہ نہ جا!
یہ تو ہر شخص کو کہہ دیتے ہیں سودائی ہے
زندگی کو ذرا رنگین بنانے کے لئے
میں نے اکثر تری آنکھوں کی قسم کھائی ہے
دل ہو ویران تو محسوس یہ ہوتا ہے علیم
چاندنی رات بھی اک گریۂ تنہائی ہے!



چاندنی رات ستاروں پہ سوار آئی ہے
جھوم کر میکدہ بر دوش بہار آئی ہے
زندگی میری نہ معلوم خوشی کے اوقات!
کس سمن پوش کے کوچے میں گذار آئی ہے
یوں ڈبو کر ہمیں لوٹی ہے مسرّت سے حیات
کوئی سمجھے کہ کنارے پہ اُتار آئی ہے
آج یوں گھر میں نظر آتی ہے رونق مجھ کو
جیسے اُجڑے ہوئے گلشن میں بہار آئی ہے
غم کی افکار میں ڈوبی ہوئی راتوں میں عالم
نیند بھی صورتِ الزام قرار آئی ہے!



وہ جبیں میرے مقدر کا سہارا نہ ہُوا
وہ ستارہ مری قسمت کا ستارا نہ ہُوا
آج اُس راحتِ جاں سے نہ ملاقات ہوئی
آج سینے کی تپش کا کوئی چارہ نہ ہُوا
اُن کا شکوہ ہی بھلا کیا کہ وہ اپنے تو نہ تھے
دل کا رونا ہے کہ دل ہو کے ہمارا نہ ہُوا
ہم نے چاہا تھا کہ ہم ترکِ تمنّا کر لیں
لیکن افسوس بغیر اس کے گذارا نہ ہُوا
ناخدا کا تو عدم حالِ پریشاں تھا بہت
غیب سے بھی کوئی بروقت اشارا نہ ہُوا



ترے شباب کو او گل غدار دیکھا ہے
لباسِ نشہ میں خوابِ بہار دیکھا ہے
ترے نفس سے بھی چٹکا نہیں کوئی غنچہ
یہ حادثہ بھی نسیمِ بہار دیکھا ہے
تری حسین پریشانیوں کی عمر دراز
ہمارا حال بھی اے زلفِ یار دیکھا ہے
کسی حسین کی آنکھوں کو اپنا ہوش نہ تھا
عجیب رقص سرِ رہگزار دیکھا ہے
مری نظر کا مجھے کوئی اعتبار نہیں!
تری نظر سے تجھے بار بار دیکھا ہے
ہوئی ہے جب بھی عدم ان کو دیکھنے کی ہوس
بڑے خلوص سے بے اختیار دیکھا ہے



مزاج دل کا خلل آفریں ہے جینے میں
میں ناخدا سے بہت تنگ ہوں سفینے میں
گری تھی بوند کہ میدانِ حشر جل اُٹھا
یہ کس کے دل کی تپش تھی ترے پسینے میں
جنوں کو سایۂ گیسو میں چین لینے دے
بس ایک بار کسی آتشیں مہینے میں!
ہم آفتاب پرستوں کو فصلِ گل میں علامؔ
پلا شراب ستاروں کے آبگینے میں!!



کبھی کشادہ دلی سے جو یار ملتا ہے
نظر کو چین، جگر کو قرار ملتا ہے
کہیں تو کیسے کہیں اُس سے ماجرا دِل کا
ملے بھی وہ تو سرِ راہگذار ملتا ہے
غمِ زمانہ کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ
بڑے تپاک سے لیل و نہار ملتا ہے
تصوّرات کے اُجڑے ہوئے گلستاں میں
کہیں کہیں تو نشانِ بہار ملتا ہے
عدمؔ کمی نہیں دُنیا میں نعمتِ غم کی
ہمارا رزق ہمیں بے شمار ملتا ہے!



غمِ ہائے روزگار میں وہ دِل کشی رہی
دنیا کی ہر خوشی سے ہمیں دشمنی رہی
صرف اِک قدم اُٹھا تھا غلط راہِ شوق میں
منزل تمام عمر مجھے ڈھونڈتی رہی!
ظلمت کا دائرہ جسے کہتے ہیں زندگی
دو چار دن تو اس میں بڑی روشنی رہی
طوفان بڑے غرور سے پھُنکارتا رہا
کشتی بڑے خلوص سے ضِد پر اڑی رہی
مت پوچھ اُن طویل شبوں کا معاملہ
اس گیسوئے دراز سے جب دوستی رہی
شاید مرے خلوص میں کچھ نقص تھا علامؔ
ان کو مرے خلوص سے کچھ بدظنی رہی



حیات نام ہے جس کا شرار ہے ساقی
علاج اُس کا مئے خوشگوار ہے ساقی
نہ دیکھو میرے گریباں کی سمت حیرت سے
تری قبا بھی یونہی تار تار ہے ساقی
دلوں کو دام میں لانا ہی شہریاری ہے
خلوص سب سے بڑا اقتدار ہے ساقی
غمِ زمانہ کو کیا اور شرمسار کروں
غمِ زمانہ بہت شرمسار ہے ساقی
چل آ کہ بادہ پئیں اور چمن میں رقص کریں
فضا جواں ہے! ہوا مشکبار ہے ساقی
نظامِ عالمِ کہنہ کو منتشر کر دے
میری طرف سے تجھے اختیار ہے ساقی
عدمؔ بھی ایک تجلّی ہے اس خمستاں کی
جہاں گدا کی صفت شہریار ہے ساقی



سُنا تھا لوگ بڑے دِلنواز ہوتے ہیں
مگر نصیب کہاں کارساز ہوتے ہیں

سُنا ہے پیرِ مغاں سے یہ بارہا میں نے
چھلک پڑیں تو پیالے بھی ساز ہوتے ہیں

کسی کی زُلف سے وابستگی نہیں اچھی
یہ سلسلے دِلِ ناداں دراز ہوتے ہیں

وہ آئینے کے مقابل ہوں جب خُدا بن کر
ادا و ناز سراپا نماز ہوتے ہیں

ؔخلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

